زبان و ادب، تہذیب و ثقافت کا ترجمان

نیا دور

محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

قیمت: ۱۰/روپئے

مئی ۲۰۱۷ء

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ جناب یوگی آدتیہ ناتھ وزیر اعظم جناب نریندر مودی کا استقبال کرتے ہوئے۔
ان کے ہمراہ اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائک بھی ہیں۔

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ جناب یوگی آدتیہ ناتھ اسمبلی سیشن کے موقع پر

جلد : ۷۲ شمارہ : ۲

ماہنامہ
نیا دور
لکھنؤ

مئی ۲۰۱۷ء

پبلشر: سدھیش کمار اوجھا
ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش

ایڈوائزر
ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی

ایڈیٹر
سہیل وحید

فون: 9415007694
Ph. No. 2239132 Ext. 115
Email:
nayadaurmonthly@gmail.com

تزئین کار : وقار حسین

مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج لکھنؤ
شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش
زرِسالانہ : ایک سو دس روپئے
فی شمارہ : دس روپئے

ترسیل زر کا پتہ
ڈائرکٹر
انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
پارک روڈ، اتر پردیش، لکھنؤ 226001
Please send M.O./Bank Draft in favour of Directer, Information & Public Relations Department, UP, Lucknow

خط وکتابت کا پتہ
ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱
بذریعۂ رجسٹری:
ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

عنوانات

اداریہ
اپنی بات ..... ایڈیٹر ۲

مضامین
انگریزی زبان اور اردو طنز ومزاح ..... ڈاکٹر مظہر احمد ۳
امیر خسرو ہندوستان کی تہذیبی آئین سازی کا بنیاد گزار ..... ڈاکٹر ارشاد نیازی ۷

افسانے
عدم گناہ ..... شموئل احمد ۱۳
غبار ..... اسرار گاندھی ۱۷
نیم سرائے ..... عادل فراز ۲۱

گزشتہ لکھنؤ
مشاعرے ..... مرزا جعفر حسین ۲۷

ہندی کہانی
لال پان کی بیگم ..... فنیشور ناتھ رینو ۳۳

ہندوستانی زبانیں
ایندھن ..... حمید دلوائی ۴۱

غیر ملکی ادب
دادا پوتے ایک سے ..... انتون چیخوف ۴۹

غزلیں
خلوص اب دور ہوتا جا رہا ہے ..... مست حفیظ رحمانی ۶
مخالفین کو حیران کرنے والا ہوں ..... منیش شکلا ۶
ذہن کو میرے جگا فکر کو مشکبار کر ..... سلمیٰ شاہین ۱۲
مجھ کو شب فراق کا غم یاد آ گیا ..... آفتاب احمد خاں ۱۲
اب جنوں سرحد امکاں سے سوا چاہتا ہے ..... توصیف خاں ۲۶
عدل وانصاف بھی کرتی تھی میں ..... لئیقہ سلطانہ ۲۶
میانِ مقتل لہو بہانے کی رُت نہیں ہے ..... دیدار اکبر پوری ۳۲
میرے اعمال کی ساری کمی بول اٹھے گی ..... سنجئے مصرا شوق ۳۲
یوں نہ دکھلاؤ اک جھلک جانی ..... علی اصغر حیدری عازی ۴۰
ساحلوں کی دوریوں کے درمیاں ..... نسرین نکہت ۴۰

نقد وتبصرے
افسانیات ..... عابد سہیل ..... نجیب انصاری ۵۱
ایک جھروکھا افسانوں سے ..... راجیو پرکاش ساحر ..... شاہد کمال ۵۲

ترقیات
موجودہ حکومت کے فیصلے اور ہدایات ۵۳

نیا دور میں شائع ہونے والی تمام تر تخلیقات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اتر پردیش کا متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

اداریہ

تبدیلی ایک فطری عمل ہے۔ روزِ اول سے لے کر روزِ آخر تک یہ اسی طرح جاری و ساری رہے گی۔ انسان کے دست اختیار میں یہ نہیں ہے کہ وہ فطرت کے کارخانے میں ذرا سا بھی دخیل ہو جائے۔ تبدیلی ہمیشہ خوش آئند ہو، اس کی ضمانت نہیں لی جاسکتی لیکن یہ کلیہ بھی نہیں ہے۔

شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ نے اپنی مشہور تصنیف 'بانگ درا' کی ایک نظم 'ستارہ' میں کیا خوب کہا ہے:

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

ظاہر ہے کہ تبدیلی کے اس عمل سے کوئی بھی مبرا نہیں۔ 'نیا دور' کی ادارت کی ذمہ داری ایک بہت اہم کام ہے۔ ماضی قریب میں 'نیا دور' کی ادارت کے فرائض اردو ادب کی نامور شخصیتوں نے انجام دئے ہیں۔ وہ لوگ جن کے قلم کا جادو سر چڑھ کو بولتا تھا، جب وہ شخصیتیں 'نیا دور' کی ادارت سے وابستہ ہوئیں تو انہوں نے اپنی ادبی ذہانت سے 'نیا دور' کو ایک الگ شناخت کے ساتھ متعارف کرایا۔

ہمیں اس بات کی خوشی کم اور الجھن زیادہ ہے کہ 'نیا دور' جیسے شہرۂ آفاق رسالے کے مدیر کے طور پر خدمت کرنے کا موقع میسر آیا ہے۔ ہم نے اپنے تئیں کوشش کی ہے کہ 'نیا دور' کے معیار پر کسی قسم کی آنچ نہ آئے اور اسے قارئین کے درمیان زیادہ سے زیادہ مقبول بنانے کی کوشش کی جائے۔

اسی بنا پر ہم نے 'غیر ملکی ادب' کا سلسلہ شروع کیا ہے، آخر ہم پر بھی فورٹ ولیم کالج کی روایات کی پاسبانی کی کچھ نہ کچھ ذمہ داری تو ضرور بنتی ہے۔ ہم نے ہمیشہ محسوس کیا کہ اردو کی تصانیف کا موازنہ جا بجا روسی، انگریزی اور دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں سے کیا جاتا رہا ہے لیکن ہندوستان کی ۲۲ قومی زبانوں بالخصوص جنوبی ہندوستان کی زبانوں کے ادب سے ہم واقف نہیں ہو پاتے ہیں۔ کشمیری، ڈوگری، پنجابی، کنڑ، ملیالم، گجراتی جیسے زبانوں میں بھی اعلیٰ درجے کا ادب تخلیق کیا جاتا ہے۔ ہمیں ان سے بھی روشناس ہونے کا حق حاصل ہے۔ اسی کے مدنظر ہم نے 'ہندوستانی زبانیں' کا سلسلہ شروع کیا ہے جس کے تحت ہر شمارے میں ہم ہندوستان کی دیگر زبانوں میں تخلیق کئے جانے والے ادب کے تراجم پیش کریں گے۔

چونکہ ہندی اور اردو زبان ہمارے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی علامت تصور کی جاتی ہے لہٰذا ہندی زبان میں تخلیق کئے جانے والے ادب سے اپنے قارئین کو روشناس کرانے کے لئے ان کے تراجم کی اشاعت کی پیش رفت کی ایک کوشش ضرور کی جارہی ہے اس لئے 'نیا دور' کے ہر شمارے میں ہم ہندی کی ایک کہانی کا ترجمہ ضرور شائع کریں گے۔

'نیا دور' میں لکھنؤ کے تہذیبی و تمدنی آثار کو پیش کرنا اس لئے ضروری ہے کہ اس کے بغیر اردو ادب کا تصور لایعنی ہے۔ اس نکتۂ نظر کے تحت ماضی کے اس لکھنؤ کو محققین اور دانشوروں کی تحریر کے آئینہ میں پیش کیا جائے گا جسے ہم نے اپنے خوابوں میں بسایا ہوا ہے۔

ہمیں اعتماد ہے قارئین 'نیا دور' کی جانب سے ہماری ان ادبی کوششوں کو ضرور پذیرائی حاصل ہوگی۔ ہمیں ایسی معیاری تصانیف، تخلیقات اور تحریروں کا انتظار رہے گا جن کا عالمی سطح پر اردو دنیا کو بھی انتظار رہتا ہے۔

ہم جلد ہی 'نیا دور' کو عالمی سطح پر مقبول بنانے کے لئے اس کے ای ایڈیشن کو بھی شروع کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ دوسرے ممالک میں بھی 'نیا دور' اپنی نئی شناخت قائم کر سکے۔ فی الوقت 'نیا دور' www.information.up.nic.in پر موجود رہتا ہے۔

سہیل وحید

انگریزی زبان اور اردو طنز و مزاح

ڈاکٹر مظہر احمد
3358 کوچہ چلال بخاری، بازار دہلی گیٹ، نئی دہلی
موبائل: 9212089910

شعرائے طنز و مزاح کے یہاں ابتدا ہی سے جو مشہور اور ہر دل عزیز اسالیب مقبولِ عام رہے ہیں ان میں زبان و بیان کی ندرتوں، تشبیہات و استعارات کی لطافتوں، صنعتوں کے خلّاقانہ استعمال، تضمین و پیروڈی، تضاد و تقابل کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں کے الفاظ کا استعمال بھی خاص طور پر قابلِ ذکر رہا ہے۔ خاص کر فارسی اشعار اور مصرعوں کے استعمال کا چلن بطور تضمین طنز و مزاح نگار شعرا کی خلّاقانہ بصیرت اور فنی پختگی کی دلیل ہے۔ نیز کلاسیکی روایت سے ان کی واقفیت اور قدیم متون کی جدید مضحک تعبیرات کی ادائیگی نے ایسے شعرا کے کلام کو اعتبار اور شرفِ مقبولیت عطا کیا ہے۔

فارسی زبان کے اشعار اور مصرعوں کے پہلو بہ پہلو اس نوع کی شاعری میں انگریزی زبان کے الفاظ کا چلن بھی روزِ اوّل سے ہی نظر آتا ہے۔ اور غور طلب بات تو یہ ہے کہ انگریزی کے یہ الفاظ جدید علامتی پیرائے میں ادا کئے گئے ہیں۔ اودھ پنچ کے شعرا کہ جو طنز و مزاحیہ شاعری کے جدید ابتدائی نمونے تخلیق کر رہے تھے، کے یہاں انگریزی الفاظ دراصل ہندوستان پر انگریزوں کے تسلّط اور مغربی تہذیب کی علامت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ لسّان العصر اکبرؔ الٰہ آبادی نے تو ان انگریزی الفاظ کے ذریعے مغربی تہذیب کے بڑھتے ہوئے سیلاب پر جیسے بند تعمیر کرنے کا کام کیا ہے۔ انجن، ٹائپ، پائپ، تھیٹر، بی۔اے، پینشن، امیٹیشن، گاؤن اوران جیسے اور بہت سے الفاظ محض الفاظ نہیں بلکہ ان کے پسِ پشت شاعر کی طنزیہ بصیرت کے ساتھ ساتھ تہذیب کی شکست و ریخت کا نوحہ بھی کارفرما نظر آتا ہے۔

اکبرؔ الٰہ آبادی کے بعد طنز و مزاحیہ شاعری میں انگریزی الفاظ کے استعمال کا جیسے باقاعدہ ایک سلسلہ چل نکلا۔ بطورِ خاص آزادی کے بعد کی شاعری میں

اکبرؔ الٰہ آبادی کے بعد طنز و مزاحیہ شاعری میں انگریزی الفاظ کے استعمال کا جیسے باقاعدہ ایک سلسلہ چل نکلا۔ بطورِ خاص آزادی کے بعد کی شاعری میں اس کے نمونے کثرت سے نظر آتے ہیں۔

شعرا نے ایسے الفاظ سے جہاں ایک طرف علامتی اظہارِ بیان کی طرح ڈالی وہیں دوسری طرف مزاحیہ افکار و اشکال کی تخلیق بھی کی ہے۔ کہیں ایسے الفاظ طنزیہ وار کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں تو کہیں مضمون آفرینی اور خیال بندی کو مضحکہ خیز بنانے میں معاونت کرتے ہیں۔

اس کے نمونے کثرت سے نظر آتے ہیں۔ شعرا نے ایسے الفاظ سے جہاں ایک طرف علامتی اظہارِ بیان کی طرح ڈالی وہیں دوسری طرف مزاحیہ افکار و اشکال کی تخلیق بھی کی ہے۔ کہیں ایسے الفاظ طنزیہ وار کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں تو کہیں مضمون آفرینی اور خیال بندی کو مضحکہ خیز بنانے میں معاونت کرتے ہیں۔

آیئے آزادی کے بعد کی طنز و مزاحیہ شاعری میں انگریزی الفاظ کے چلن پر ایک سرسری نظر ڈالیں۔

سیّد محمد جعفریؔ طنز و مزاح کی شاعری کا ایک معتبر اور سنجیدہ نام ہے۔ ان کے یہاں فن کی نزاکتوں کے ساتھ ساتھ تہذیب و شائستگی اور زبان و بیان کی خوبیاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ ان کی سیاسی و سماجی طنزیہ شاعری میں انگریزی الفاظ علامتی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ ملکی اور بین الاقوامی سیاسی موضوعات پر قلم اٹھاتے ہوئے اکثر انہوں نے انگریزی الفاظ کا استعمال کیا ہے۔

انگریزی الفاظ سے وہ افہام و تفہیم کو نئی جہتیں عطا کرتے ہیں۔ ''یو۔این۔او'' کے عنوان سے ان کی ایک معرکتہ الآرا نظم اقوامِ متحدہ کی کارگزاریوں کو دائرۂ طنز میں لاتی ہے۔ اس نظم میں انکل سام، جان بل، کامن ویلتھ اور دیگر انگریزی الفاظ خاص سیاسی پس منظر میں ادا کئے گئے ہیں۔ یہاں صرف ایک بند ملاحظہ فرمائیں۔

یو این او دراصل ہے اک راہوارِ تیز گام
جس پہ انکل سام نے ڈالی ہے ڈالر کی لگام
اور کامن ویلتھ اک لنگڑے سے ٹٹو کا ہے نام
جان بل بیٹھے ہوئے ہیں اس پہ باصد احتشام
آگے انکل سام پیچھے جان بل دونوں سوار
ایشیا میں کھیلتے پھرتے ہیں قوموں کا شکار

مثالیں اور بھی ہیں مگر یہاں طوالت کے ڈر سے

گریز کیا جاتا ہے۔ شہباز امروہی نے بھی انگریزی الفاظ سے زبان و بیان کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ مزاحیہ مضمون آفرینی کی ہے۔ بلکہ انگریزی الفاظ کا جیسا شاطرانہ استعمال ہمیں شہباز کے یہاں نظر آتا ہے ویسا کسی اور شاعر کے یہاں نظر نہیں آتا۔ ایک مزاحیہ قطعہ میں شہباز جنّت سے ابلیس کے اخراج کے قدرے پامال مضمون کی ادائیگی میں انگریزی الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے قدرے غیر مزاحیہ مضمون کو مضحک بنانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

ہے یہ قصّہ مختصر شیطان کے اخراج کا
اس قدر پبلک میں جس کا پبلی کیشن ہو گیا
تھا وہ اک ناٹی بوائے ،خلد کے اسکول کا
حکم انسپکٹر سے اس کا رسٹی کیشن ہو گیا

شیطان کے جنّت سے اخراج کے مضمون کو انگریزی اصطلاحوں کے استعمال نے ہی مزاحیہ رنگ دے دیا ہے۔ شیطان کو ناٹی بوائے کہنا، خدا کے لئے لفظِ انسپکٹر کا استعمال اور اس کے حکم سے شیطان کا رسٹی کیشن ہونا قطعہ کو پر لطف و پر کیف بنا دیتا ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ انگریزی الفاظ میں صنعتِ مراۃ النظیر کی رعایت بھی موجود ہے۔ شہباز امروہوی کی طنز و مزاحیہ شاعری میں صنعتوں کا استعمال بکثرت نظر آتا ہے اور ان صنعتوں کے لئے انہوں نے انگریزی الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے جو فن پر ان کی گرفت کے ساتھ ساتھ ان کی علمی صلاحیتوں کا بھی غماز ہے۔ صنعت ایہام کی نزاکتوں سے اہلِ نظر واقف ہیں۔ بغیر وضاحت کے یہاں دو قطعے پیش کئے جاتے ہیں۔

بوسہ تو ہے کیا؟ وصل سے انکار نہیں
دنیا میں عجب چیز ہے انگلش لیڈی
کھل جاتی ہے رکھتے ہی سوئچ پر انگلی
کہتے ہیں اسی ٹارچ کو ایور ریڈی
مل گئی ہے شیخ بدّھو کو بہ حسنِ اتّفاق
کارپوریشن میں جس دن سے صدارت کی چیئر
کہتے ہیں میری سواری کے لئے اک ہارس لاؤ
بن گیا ہوں قدرتِ اللہ سے اب میں مئیر

دونوں قطعوں میں قافیے انگریزی کے ہیں۔ پہلے قطعے میں ایور ریڈی میں ایہام کا پہلو غور طلب ہے۔ نیز انگلش لیڈی کی جنسی آزادی پر طنزیہ وار بھی قابلِ توجّہ ہے۔ دوسرے قطعے میں مئیر کے دو معنی ہیں۔ معنی قریب شہرِ قاضی اور معنی بعید ''گھوڑی'' اور ہارس کی رعایت سے گھوڑی کے معنی قابلِ غور بھی ہیں اور پُر از مزاح بھی۔ ایک دیگر قطعے میں خاندانی منصوبہ بندی کے مروّجہ طریقوں میں سے ایک پر طنزیہ وار کرتے ہوئے انگریزی الفاظ کا اُستادانہ استعمال کرتے ہیں اور ایہام و تجنیس کے ذریعہ جوش و اثر میں اضافہ کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

ہول کھاؤں میں نہ کیونکر دیکھ کر اس حال کو
ملک کے گھر گھر میں ہے فرماں روائی لوپ کی
قابلِ نفرت تھا پہلے قوم میں ہر لوپ ہول
ہول نیشن آج ہے لیکن فدائی لوپ کی

اہل نظر کے لئے قطعے کی تشریح کی ضرورت نہیں صرف لطف اٹھائیں اور داد دیں دلاور فگار بھی اپنی شاعری کو انگریزی الفاظ کے نگینوں سے جڑتے ہیں اور انہیں بھی انگریزی الفاظ سے مضحک مضمون آفرینی کرنے میں ملکہ حاصل ہے۔ ایک قطعہ بعنوان ''مسٹیک'' انگریزی الفاظ کے برجستہ اور برمحل استعمال کی عمدہ مثال ہے۔ جس میں بہ زبانِ انگریزی صدرِ شعبۂ اردو کو موضوعِ مزاح بنایا گیا ہے۔

اک یونیورسٹی میں کسی سوٹ پوش سے
میں نے کہا کہ آپ ہیں کیا کوئی سارجنٹ
کہنے لگے کہ آپ سے ''مسٹیک'' ہو گئی
آئی ایم دی ہیڈ آف دی اردو ڈپارٹمنٹ

ایک اور قطعے میں انگریزی اور اردو الفاظ یکجا ہو کر ایہام کا لطف دے رہے ہیں اور یہی ایہام مزاح کا محرّک بنا ہے۔

کسی کو ذوق نے جنّت سے کل یہ تار بھیجا ہے
کہ اہلِ ذوق میری خدمتوں کو بھول جاتے ہیں
مگر حالی سے ہر اک صاحبِ دل کو عقیدت ہے
کوئی تیوہار ہو یہ لوگ ''حالی ڈے'' مناتے ہیں

متذکرہ دونوں قطعات انگریزی الفاظ کے پر کیف اور برجستہ استعمال کی مثالیں ہیں۔ اگر یہاں انگریزی الفاظ کے اردو مترادفات رکھ دئے جائیں تو نفسِ مضمون ہی فنا ہو جائے گا اور قطعے بے معنی یا غیر مزاحیہ ہو جائینگے۔ زبان کا یہ استعمال فنّی چابکدستی اور الفاظ پر مکمل مہارت کا متقاضی ہوتا ہے اور اسے نبھانا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں مگر دلاور فگار اس پر کماحقہٗ قادر ہیں۔ انگریزی الفاظ کی بازیگری کی ایک اور عمدہ مثال ان کی غزل بعنوان ''پیور غزل ان اردو'' ہے۔ اس میں تقریباً نوّے فی صدی انگریزی کا ہی استعمال کیا گیا ہے۔ یہ اینگلو انڈین غزل بظاہر بہت آسان نظر آتی ہے مگر لفظ و معنی کے ٹکراؤ اور انگریزی و اردو کی ملاوٹ نے اسے قدرے مشکل بنا دیا ہے اور ردیف و قافیے کے ساتھ ساتھ بحر کو بھی نبھا جانا دلاور فگار کا ہی کمال ہے۔ چند اشعار۔

نہ ہو جب ہارٹ ان دی چیسٹ پھر ٹلنگ ان دی ماؤتھ کیوں
ٹو بیوٹی فائی دس لائن، تھرو سم لائٹ ان اردو
پوئٹری کی نشستیں، کلچرل شو ہی سہی لیکن
پلیز اے صاحبانِ دل مجھے انوائٹ ان اردو
مری نظموں کا ایک والیوم ہے پبلشڈ اردو میں
دیر فور آئی وڈ لائک اے کاپی رائٹ ان اردو

ان چند امثال کے علاوہ دلاور فگار کا کلیات انگریزی الفاظ کی آمیزش سے بھرا پڑا ہے۔ یہاں ایک نظم کا حوالہ اور دیا جاتا ہے۔ آبادی کے مسئلے پر ان کی نظم ''کراچی کا قبرستان'' ایک عمدہ طنز و مزاحیہ نظم

ہے۔نظم طویل ہے اور موقع بہ موقع انگریزی الفاظ معنی آفرینی میں اضافہ کرتے نظر آتے ہیں۔یہاں چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

سیٹ قبرستان میں پہلے وہ مردے پائیں گے
جو کسی مردہ منسٹر کی سفارش لائیں گے
کارپوریشن کرے گا اک روز لیوشن یہ پاس
اب حکومت مرنے والوں سے کرے یہ التماس
آپ کو مرنا ہے تو پہلے سے نوٹس دیجیے
یعنی جرمِ انتقالِ ناگہاں مت کیجیے
ایک مردہ بھاگ اٹھا ہے چھوڑ کر گور و کفن
قبر پر مرحوم کی ہے قبضۂ کسٹوڈین
صرف زندوں ہی کو فکرِ عیش و آرائش نہیں
اب تو اس دنیا میں مُردوں کی بھی گنجائش نہیں

رضا نقوی واہیؔ کی نظم بعنوان ''معرکۂ جہیز و دین مہر'' متوسط گھرانوں میں شادی کے کاروبار میں تبدیل ہو جانے پر طنزیہ وار کرتی ہے۔لڑکے کی بولیاں لگائی جاتی ہیں اور اگر لڑکا تعلیم یافتہ ہے تو توقعات اور بھی بڑھ جاتی ہیں۔واہیؔ نے اس پوری صورتِ حال پر ایک کامیاب طنزیہ نظم تخلیق کی ہے اور جا بجا انگریزی الفاظ کے استعمال سے طنز کا کام لیا ہے۔یہاں چند اشعار پیشِ خدمت ہیں۔

جیسے ہی نورِ چشم نے بی۔اے کیا ادھر
بزنس کا مال ان کو سمجھنے لگے پدر
بیڑا ہوا تھا تھرڈ ڈویژن میں گرچہ پار
شادی کا بھوت باپ کے سر پر ہوا سوار
سودا بلیک میں جو چکانے کا تھا خیال
گاہک کی جستجو میں لگے وہ نکو خصال
بیٹے کو چک سمجھ لیا اسٹیٹ بینک کا
سمدھی تلاش کرنے لگے ہائی رینک کا

آخری شعر میں اسٹیٹ بینک کا قافیہ ہائی رینک برموقع و برجستہ بھی ہے اور انگریزی الفاظ کے اس استعمال نے طنز کو بھی دو آتشہ کر دیا ہے۔انگریزی الفاظ کے استعمال کے اسی سلسلے میں ساغرؔ خیامی کی ایک نظم ''کرکٹ میچ'' قابلِ ذکر ہے جس میں کرکٹ کی انگریزی اصطلاحوں سے ساغرؔ خیامی نے مزاحیہ مضمون آفرینی کی ہے۔واقعہ یوں ہے کہ لڑکوں کی کرکٹ ٹیم کا مقابلہ لڑکیوں کی ٹیم سے ہو گیا ہے۔اب اس مضحکہ خیز صورتِ حال نے شاعر کی رگِ ظرافت کو پھڑکا دیا ہے۔دو بند ملاحظہ فرمائیں۔

ناز و ادا و حسن نے جادو جگا دیے
پہلے تو اوپنر کے ہی چھکّے چھڑا دیے
ون ڈاؤن پر جو آئے تو اسٹمپ اڑا دیے
راہِ فرار کے بھی تو رستے بھلا دیے
گو کیچ ویری لو تھا مگر بے دھڑک لیا
اک محترم کو اک نے گلی میں لپک لیا
کیا کیا بیان کیجیے اک اک کا بانکپن
جلوہ فگن زمیں پہ تھی تاروں کی انجمن
حسن و شباب و عشق سے بھرپور ہر بدن
شاعر پویلین میں تھے پہنے ہوئے کفن
جتنی تھیں بیوٹی فل وہ سلپ اور گلی پہ تھیں
جتنی تھیں اوور ایج سبھی باؤنڈری پہ تھیں

اوپنر، ون ڈاؤن، کیچ، ویری لو، سلپ، گلی، پویلین، بیوٹی فل اوور ایج وغیرہ انگریزی کے یہ الفاظ ہی نظم کو مزاحیہ پیکر عطا کر رہے ہیں اور ان الفاظ کے بر محل و برجستہ استعمال کے ساتھ ساتھ مزاحیہ منظر نگاری، شاعر کی تخیل کارفرمائی اور ذہانت فکر کی مثال بھی ہے۔

مزاحیہ غزل گوئی کی روایت میں بھی انگریزی الفاظ کی آمیزش نے رنگارنگ کارفرمائیاں کی ہیں۔یہاں ایک طرف انگریزی الفاظ معنی آفرینی میں تعاون کر رہے ہیں وہیں دوسری طرف انگریزی قوافی کے ذریعے بھی مضحک اشعار تخلیق کئے جا رہے ہیں۔انگریزی قافیوں کے سلسلے میں مصطفیٰ کمال کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

وہ بے وفا تھے راہ کی Turning میں رہ گئے
ہم تو اکیلے Life کی Burning میں رہ گئے
شادی کے بعد وہ کئی بچّوں کی ہیں Mother
غافل تھے ہم جو عشق کی Learning میں رہ گئے
سب کی ٹرین عشق کی منزل پہ جا چکی
ہم انتظارِ یار کی Shunting میں رہ گئے

نسیمؔ سحر نامی ایک پاکستانی شاعر کی غزل میں بھی انگریزی الفاظ کے قوافی مضحک مضمون نگاری کے موجب بن گئے ہیں۔

عشق کرنا بھی سیکھ جاؤں گا
میں ہوں لیکن ابھی New جاناں
پیار سے تو نے مجھ کو دیکھا ہے
پارٹی مجھ پہ ہے Due جاناں
میری مونچھوں میں تیری زلفیں ہیں
کتنا دلکش ہے یہ View جاناں
تیری پلکوں پہ اشک کا قطرہ
جس طرح Rose پر Dew جاناں
ناز میرے اٹھا کہ دنیا میں
مجھ سے عاشق تو ہیں Few جاناں

غرض یہ چند مثالیں ہیں جن کے ذریعے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شعرائے طنز و مزاح نے حتیٰ المقدور انگریزی زبان کے الفاظ کا استعمال اپنی شاعری میں کیا ہے اور ایسا کرتے ہوئے زبان کی ندرتوں اور اس کی خلّاقانہ اداؤں کو بروئے کار لائے ہیں۔انگریزی الفاظ میں اردو صنعتوں کو برت کر ہمارے چند اساتذۂ فن نے تو اپنی قادر الکلامی اور جدّت طرازی کے ثبوت بھی فراہم کئے ہیں۔مثالیں اور بہت ہیں مگر یہاں طوالت کے ڈر سے سلسلۂ کلام منقطع کیا جاتا ہے۔

❑❑❑

غزل

خلوص اب دور ہوتا جا رہا ہے
جہاں بے نور ہوتا جا رہا ہے

ہر اک کے دل میں ہے اُس کا بسیرا
جو خود سے دور ہوتا جا رہا ہے

ہماری فکر کا روشن ہے سورج
جہاں معمور ہوتا جا رہا ہے

رہا ہے ساتھ جو صدیوں ہمارے
وہ ہم سے دور ہوتا جا رہا ہے

وہ دل کل تک تھی جس کی بادشاہی
غموں سے چور ہوتا جا رہا ہے

کہاں سے لائیں ہم اتنی صلیبی
ہر اک منصور ہوتا جا رہا ہے

جو کل تک مستؔ تھا مستی میں اپنی
وہ اب مشہور ہوتا جا رہا ہے

مستؔ حفیظ رحمانی
271-A, پرانا سیتاپور۔ یوپی
موبائل:9208056163

غزل

مخالفین کو حیران کرنے والا ہوں
میں اپنی ہار کا اعلان کرنے والا ہوں

سنا ہے دشت میں وحشت سکون پاتی ہے
سو اپنے آپ کو ویران کرنے والا ہوں

فضا میں چھوڑ رہا ہوں خیال کا طائر
سکوت عرش کو گنجان کرنے والا ہوں

مٹا رہا ہوں خرد کی تمام تشبیہیں
جنوں کا راستہ آسان کرنے والا ہوں

حقیقتوں سے کہو ہوشیار ہو جائیں
میں اپنے خواب کو میزان کرنے والا ہوں

کوئی خدائے محبت کو باخبر کر دے
میں خود کو عشق میں قربان کرنے والا ہوں

سجا رہا ہوں تبسم کا اک نیا لشکر
ہجوم یاس کا نقصان کرنے والا ہوں

منیش شکلا
8/4، ڈالی باغ، آفیسرس کالونی، لکھنؤ
موبائل: 9415101115

امیر خسرو

ہندوستان کی تہذیبی آئین سازی کا بنیاد گزار

ڈاکٹر ارشاد نیازی
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی
موبائل: 9868099314

انسانی تہذیب اور تاریخ کے صفحات میں کئی عظیم شخصیات کا ذکر محفوظ ہے جو اپنی غیر معمولی صلاحیتوں اور کارناموں کی وجہ سے وقت اور زمانے کی سرحدوں سے پرے سب ملکوں اور ہر زمانے میں یکساں مقبولیت کے حامل اور سرمایۂ وراثت کے اساس بنتے ہیں۔ اس کی وجہ ان کے جینے کی چاہ، لگن اور امنگ ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں چھا جانے والی ذہانت اور زندگی کے راز و رموز میں ڈوب کر سراغِ زندگی کی یافت ان کا روزمرہ رہا ہے۔ ایسے لوگ دلوں میں آگ، روحوں میں اضطراب اور آنکھوں میں تاب لے کر جیتے ہیں۔ پامال شدہ راہوں پر چلنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ ایسی ہی شخصیات میں ایک نام حضرت امیر خسروؔ کا بھی ہے۔

ایسے عجیب و غریب انسان صدیوں میں نہیں، ہزاروں سال میں پیدا ہوتے ہیں۔ ویسے تو ہر فنکار اور بطورِ خاص مفکر، فلسفی اور دانشور کسی ایک ہی شعبے میں اختصاص رکھتا ہے مگر خسروؔ کی فطانت زندگی کے ہر شعبے پر کلی طور پر چھائی ہوئی تھی۔ اس لیے کہ ان کی ذات بڑی پہلو دار، لچک دار اور تہہ دار تھی۔ ایک دھنک کی طرح جس میں مختلف رنگ تھے اور ہر رنگ کا اپنا ایک رنگ، جو دامنِ دل کو کھینچتا تھا۔ انہیں رنگوں میں ایک رنگ انسان دوستی، وطن پرستی اور رواداری کا تھا۔ سوال یہ ہے کہ محبت کا یہ رنگ کیوں کر قائم ہوا؟ جواب ہندوستانی ثقافت، والدہ کی وراثت اور حضرت نظام الدین محبوبِ الٰہی کی عقیدت و محبت میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اس پس منظر کا مستقبل میں امیر خسروؔ کے تخلیقی عمل، فکر و دانش، ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور مذاہب کی تفہیم پر گہرا اثر مرتب ہوا۔ شاید یہی وجہ ہے

ایسے عجیب و غریب انسان صدیوں میں نہیں، ہزاروں سال میں پیدا ہوتے ہیں۔ ویسے تو ہر فنکار اور بطورِ خاص مفکر، فلسفی اور دانشور کسی ایک ہی شعبے میں اختصاص رکھتا ہے مگر خسروؔ کی فطانت زندگی کے ہر شعبے پر کلی طور پر چھائی ہوئی تھی۔ اس لیے کہ ان کی ذات بڑی پہلو دار، لچک دار اور تہہ دار تھی۔ ایک دھنک کی طرح جس میں مختلف رنگ تھے اور ہر رنگ کا اپنا ایک رنگ، جو دامنِ دل کو کھینچتا تھا۔ انہیں رنگوں میں ایک رنگ انسان دوستی، وطن پرستی اور رواداری کا تھا۔ سوال یہ ہے کہ محبت کا یہ رنگ کیوں کر قائم ہوا؟ جواب ہندوستانی ثقافت، والدہ کی وراثت اور حضرت نظام الدین محبوبِ الٰہی کی عقیدت و محبت میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اس پس منظر کا مستقبل میں امیر خسروؔ کے تخلیقی عمل، فکر و دانش، ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور مذاہب کی تفہیم پر گہرا اثر مرتب ہوا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ امیر خسروؔ کی تخلیقات کا چوکھا رنگ اشتراک و اتحاد ہی رہا ہے۔

کہ امیر خسروؔ کی تخلیقات کا چوکھا رنگ اشتراک و اتحاد ہی رہا ہے۔ ہندو اور مسلمان، سنسکرت اور فارسی، مذہب اور روحانیت سب کے درمیان ایک اشتراک و انضمام تلاش کرنا ہی ان کا مقصد تھا۔ خسرو کی شخصیت تہذیبوں کا سنگم تھی، لیکن ان کے دل میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت بستی تھی۔ حالانکہ ''امیر خسروؔ کے عہد میں وطن اور وطنیت کا شعور بالکل نابالغ اور ناپختہ تھا۔''(۱)

معلوم یہ ہوا کہ ''قومیت کا وہ جذبہ جو آج نظر آتا ہے، اس زمانے میں موجود تھا۔ یعنی آج سے چھ سو سال پہلے سماجی یا انفرادی زندگی میں اس کی تلاش الٹی گنگا بہانی ہے۔ منجھلے زمانوں میں سماجوں کا نظام آج سے مختلف تھا، رشتہ بندی کے اصول جدا تھے۔ اس میں سب سے زیادہ اہمیت نسب کو دی جاتی تھی۔ ہر ایک آدمی کسی خاص قبیلہ یا ذات سے وابستہ ہوتا تھا اور قبیلہ یا ذات کے لوگوں کا رشتہ کسی (حقیقی یا خیالی) مورث اعلیٰ سے جا ملتا تھا۔ سب فرد اپنے آپ کو اس کی اولاد سمجھتے تھے۔۔۔۔ سیاست کا دار و مدار نسبی اصول پر تھا۔ (۲) اس زمانے یا ایسے وقت میں اگر امیر خسروؔ مذہبی رواداری کے پاسدار اور وطن کی محبت سے سرشار نظر آتے ہیں تو یقیناً یہ حیرت انگیز بھی ہے اور ان کی شخصیت کا نشانِ امتیاز بھی کہ ان کی فکر۔ ذاتی، ملّی، قومی، ملکی اور کائناتی فرق و امتیاز سے بالاتر ہونے کے باوجود ان کے دل و دماغ پر ہندوستان کا گہرا اثر تھا۔ ہندوستان کی ہر چیز سے انہیں محبت تھی۔ اس دھرتی اور اس مٹی سے ان کو عشق تھا۔ کہنا چاہیے کہ وہ ہندوستان کے عاشقِ صادق تھے۔ اپنی فارسی اور ہندوی تخلیقات

میں امیر خسروؔ نے نہایت عقیدت سے ہندوستان کے گُن گائے ہیں۔ اپنی شاعری میں ہندوستان سے محبت کی جو حجتیں اور جوازات پیش کرتے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ 'ہندوستان دنیا کے تمام ملکوں سے بہتر اور برتر ہے۔ ''کشور ھند است بھشتی بزمین ''۔ دوسرے یہ کہ یہ ملک میری پیدائش کی جگہ، پرورش پانے کا مقام اور وطن ہے۔''

آنست یکی کیں از دور زمن
ھست مرا مولد و ماوی و وطن

ساتھ ہی یہ کہ وطن سے محبت جزو ایمان ہے۔ پھر دس دلیلیں اس بات کی دیتے ہیں کہ کیوں کر ہندوستان کو روم، عراق، خراسان اور قندھار پر فوقیت حاصل ہے۔ کئی دلیلیں اس بات کی دی جاتی ہیں کہ ہندوستان کی ہوا خراسان سے بہتر ہے۔ ساتھ ہی یہ کہ ہندوستان کے اردگرد چاروں طرف سبزہ اور پھولوں کی فراوانی ہے جس کی وجہ سے پورے سال بہار کا منظر رہتا ہے۔ ہندوستان کے پھولوں، میووں، بے گٹھلی کیلے اور پان کی تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھنے میں تو یہ ایک گھاس ہے لیکن اس سے خون پیدا ہوتا ہے، منہ کی بدبو دور کرتا ہے اور دانتوں کو مضبوط بناتا ہے۔ اس کے بعد آم اور انجیر کا موازنہ کرتے ہیں اور آم کی قدر نہ کرنے والوں کو 'لاف زد' کہتے ہیں۔ یہ بھی لکھتے ہیں کہ جو لوگ ہمارے آم پر انجیر کو ترجیح دیتے ہیں وہ اس اندھی عورت کی طرح ہیں جو بصرہ کو شام سے بہتر بتائے۔

زہے انصاف نتواں یافت ایں کام
کہ عمیا بصرہ را بہ گوید از شام
دگر کس سوئے خود گردد جھت گیر
نہد کم نغزکِ مارا ز انجیر

ان کو ہندوستان کا خربوزہ بھی بے حد پسند تھا۔ اس کی تعریف یہ کہ ''بہشت کے تمام پھلوں سے بازی لے گیا۔ اس میں آب حیات کی تاثیر ہے۔''

خربزہ گوئی کہ بہ صحرا و کشت
گوئے ربود از ثمرات بھشت (۳)

یہ تو معلوم ہے کہ ان کی تخلیقات میں ہندوستانی موضوعات اور تشبیہات شعوری فکر کا نتیجہ ہیں۔ تذکروں میں ان کی ایک تصنیف 'مناقب ہندوستان' کا نام آتا ہے۔ یہ کتاب تو اب عنقا ہے، لیکن دوسری تصانیف میں ہندوستان اور متعلقاتِ ہندوستان کا موازنہ و مقابلہ دوسرے ممالک سے کر کے وطنِ عزیز کی عظمت کے نشانات قائم کیے ہیں۔ اس سلسلہ میں مثنوی 'دول رانی اور خضر خان' میں ایک باب 'سیر باغ' کے عنوان

کئی دلیلیں اس بات کی دی جاتی ہیں کہ ہندوستان کی ہوا خراسان سے بہتر ہے۔ ساتھ ہی یہ کہ ہندوستان کے اردگرد چاروں طرف سبزہ اور پھولوں کی فراوانی ہے جس کی وجہ سے پورے سال بہار کا منظر رہتا ہے۔ ہندوستان کے پھولوں، میووں، بے گٹھلی کیلے اور پان کی تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھنے میں تو یہ ایک گھاس ہے لیکن اس سے خون پیدا ہوتا ہے، منہ کی بدبو دور کرتا ہے اور دانتوں کو مضبوط بناتا ہے۔ اس کے بعد آم اور انجیر کا موازنہ کرتے ہیں اور آم کی قدر نہ کرنے والوں کو 'لاف زد' کہتے ہیں۔

سے ہے۔ جس میں ہندوستانی پھولوں سیوتی، سوسن، بیلا، چمپا، چنبیلی، جوہی، کیوڑا، گلاب اور مولسری کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ چمپا کو پھولوں کا بادشاہ اور چنبیلی کو معشوقوں کی طرح نازک بدن بتاتے ہیں۔ ''جب یہ پھول کھلتے ہیں اور گھٹائیں چھا جاتی ہیں یا جب ان گھٹاؤں سے ہلکی پھوار آتی ہے تو گلشن فردوس کا باغ نظر آتا ہے بلکہ فردوس میں بھی ایسا خوش گوار منظر نہ ہوگا۔'' ورنہ ہر گلی باغ بہشت است''۔ ایسے پھول اگر روم و شام میں اُگتے اور عربی فارسی نام ہوتے تو وہاں کے لوگ دنیا بھر میں تعریفیں کرتے پھرتے اور آسمان سر پر اٹھا لیتے۔''(۴)

چہ بینی ار غوان و لالہ خنداں
کہ رنگے ھست بوئے نیست چنداں
گلِ مارا بہ ھندی نام زشت است
وگرنہ ھر گُلے باغِ بھشت است
گر ایں گل خاستے در روم و شام
کہ بودے فارسی یا تازیش نام
شدے معلوم تا مرغانِ آں بوم
چساں غلغل زدندے در رے و روم
کہ ای گل چنیں باشد کہ سالے
دھد بو دور ماندہ از نہالے

جب پرندوں کی باری آتی ہے تو 'موز' کی وجہ سے ہندوستان کو جنت نشان کہتے ہیں۔ طوطا کو عقل مند بتاتے ہیں۔ محبت کا یہ عالم ہے کہ کوّے کے کائیں کائیں میں بھی انہیں ایک آہنگ میسّر آتا ہے۔ جانوروں میں ہرن کی چال، گیدڑ کے زیر و بم، گھوڑے کے ناچ، بندر کی عقل، بکرے کا تھرکنا، ہاتھی کا آدمیوں کی طرح کام کرنا بہت مزے لے لے کر سناتے ہیں۔ ہندوستانی عورتوں پر جان و دل سے فدا ہیں۔ ہندوستانی حسن کے آگے کسی دوسرے ملک کا حسن ماند اور پھیکا نظر آتا ہے۔ انہوں نے بلخ اور یغما کے حسن کو اس لیے رد کر دیا کہ ''ان کے حسین تیز چشم اور ترش رخ ہوتے ہیں۔ خراساں کا حسن وہاں کے پھولوں کا سا ہے یعنی رنگ ہے، خوشبو یعنی دلآویزی نہیں۔ خسرو کو روم اور روس کا حسن بھی نہیں جچا کیونکہ ان کے معیار کے مطابق ان میں عجز و انکسار نہیں ہوتا۔ تاتاری حسینوں کے لبوں پر ہنسی نہیں دکھائی دیتی اور ختن کے حسینوں کے چہرے پر نمک نہیں ہوتا۔ سمرقند اور قندھار کے حسن میں مٹھاس کی کمی ہے۔ اسی طرح مصر اور روم کے سیمیں بدن حسینوں میں چستی پھرتی نہیں پاتے۔ خسرو کو ہندوستان کے حسن میں یہ ساری خوبیاں

دکھائی دیتی ہیں، عجز و انکسار، لبوں پر تبسم، چہرے پر نمک، شیرینی، اداؤں میں چستی اور چالاکی بھی اس لیے بے اختیار ہو کر کہتے ہیں۔(۵)

بتانِ ھند را نسبت ھمیں است
بھر یک موئے شاں صد ملکِ چیں است
چہ گیری نام از یغماں و خلخ
کہ غالب تیز چشم اند دترش رخ
چہ یاد آری سپید و سرخ را روئے
چوگلھائے خراساں رنگ بے بوئے
وگر پُرسی خبر از روم و از روس
از ایشاں نیز آید لا بہ و لوسی
سپید و سُرخ، ھمچوں کندۂ یخ
کز ایشاں دم خورد خاتون دوزخ
خطائے تنگ و چشم و پست بینی
مغل را چشم و بینی خود نہ بینی
لبِ تاتار خود خنداں نباشد
ختن را خود نمک چنداں نباشد
سمرقندی و آنچہ از قندھارند
بجز نامے زشیرینی ندارند
بمصر و روم ھم سیمیں خدانند
و لے چستی و چالاکی ندانند

ہندوستان کے علم و فضل، دانشوروں، ماہرینِ نجومیات، کلیلہ و دمنہ کی تصنیف، صفر کی ایجاد اور شطرنج کے پیچیدہ کھیل پر فخر کرتے ہیں۔ یہاں کے ہر موسم ان کے دل کو بھاتے ہیں۔ جن کا اپنا لطف اور مزہ ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے ''کہ ایک ہندوستانی مسلمان، عالم، شاعر اور ادیب اس زمانے میں کیسے جذبے، کیسے خیال رکھتا تھا۔ اسے ہندوستان کے ساتھ کیسی والہانہ محبت تھی اور وہ کس طرح اپنے وطن کو تمام دنیا کے ملکوں پر جن میں اسلامی ملک بھی شامل تھے، ترجیح دیتا تھا۔(۶)

ہندوستان کی چیزوں کی تعریف اور ترجیح میں بے جا طرفداری سے کام نہیں لیتا، جو لوگ منصف مزاج اور تجربہ کار ہیں اور جنہوں نے دنیا کے ممالک کو غور سے دیکھا ہے، میری بات کی تصدیق کریں گے۔ مگر بے انصافیوں سے یہ مطلب نہیں نکل سکتا۔ حقیقت میں ہندوستان جنت نشان ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آدم اور طاؤس بہشت سے نکال کر یہاں کیوں اتارے جاتے۔

بھشتی فرض کن ھندوستان را
کز آنجاں نسبت است بوستاں را
وگرنہ آدم و طاؤس ز انجای
کجا ایں جا شد ندی منزل آرای (۷)

امیر خسرو لوک ثقافت اور ہند اسلامی تہذیب کا ایک ایسا اساطیری نام ہے جو کئی صدیوں سے ہندوستانی فضاؤں اور اہل ہند کے دلوں میں زندہ و تابندہ ہے۔ جس کے آدرشی حسن کا مسکن سمرقند و بخارا یا ایران و خراسان نہیں بلکہ ہندوستانی رنگ ان کو بھاتا ہے۔

ان رنگوں میں بھی سنہرا اور سانولے رنگ جو تمام رنگوں سے ہم آہنگ اور جذب ہونے کی قدرت رکھتے ہیں۔ وہ اس لیے بھی کہ یہی رنگ جنت کا بھی ہے، طاؤس کا بھی اور زندگی کا بھی۔

امیر خسرو لوک ثقافت اور ہند اسلامی تہذیب کا ایک ایسا اساطیری نام ہے جو کئی صدیوں سے ہندوستانی فضاؤں اور اہل ہند کے دلوں میں زندہ و تابندہ ہے۔ جس کے آدرشی حسن کا مسکن سمرقند و بخارا یا ایران و خراسان نہیں بلکہ ہندوستانی رنگ ان کو بھاتا ہے۔ ان رنگوں میں بھی سنہرا اور سانولے رنگ جو تمام رنگوں سے ہم آہنگ اور جذب ہونے کی قدرت رکھتے ہیں۔ وہ اس لیے بھی کہ یہی رنگ جنت کا بھی ہے، طاؤس کا بھی اور زندگی کا بھی۔ ساتھ ہی شوخ و طرحدار بھی ہے اور خوبصورت و پُروقار بھی۔

امیر خسرو اپنے ہم وطنوں کے مذہب اور تمدن کا بلا تفریق مذہب احترام کرتے ہیں۔ ''ہندوؤں کے مذہب، زبان، رسم و رواج کا بیان محض رواداری سے نہیں بلکہ طرفداری کے نقطۂ نظر سے کرتے ہیں۔(۸) ایسے میں اگر یہ کہا جائے کہ ہندوستان کی تہذیبی آئین سازی اور ہندو مسلم اتحاد کے بنیاد گذار امیر خسرو ہیں تو شاید غلط نہ ہوگا۔

امیر خسرو ملکی و غیر ملکی زبانوں کے ماہر تھے۔ ہندوی ان کی مادری زبان تھی اور ترکی و فارسی والد سے وراثت میں ملی تھی۔ شاہی محل سے لے کر غریبوں کے جھونپڑوں تک اور خانقاہ سے لے کر طوائف کے کوٹھے تک انہوں نے زندگی کا ہر جلوہ دیکھا تھا۔ عوامی زندگی سے دلچسپی اور گھلنے ملنے سے مختلف مقامی زبانوں سے واقف ہوئے۔ زبان دانی میں تو شاید ہی کوئی اس زمانے میں ان کا مقابلہ کر سکتا ہو۔ یہ خوبیاں ان کی عظیم شخصیت کی دلیل ہے، جس نے ہندو۔مسلمان، اونچ۔نیچ، ذات۔پات، اور زبان و غیر زبان کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا۔

من بہ زبانھا کساں بیشتری
کردہ ام از طبع شناسا گذری
دانم و دریافتہ و گفتہ ھم
جستہ و روشن شدہ را بیش و کم

خسرو نے یہ اعتراف کیا ہے کہ وہ ہندی عربی سے کہیں اچھی بول سکتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو طوطیٔ ہند کہتے تھے۔ انہوں نے ہندوی الفاظ کا اپنی شاعری میں مختلف مقامات پر استعمال کیا ہے۔

آری آری ھمہ بیاری آری
ماری ماری برہ کی ماری آری

یا

رفتم بہ تماشائے کنار جوئے

دیدم بلب آب زن هندوئے
گفتم صنما بهائی زلفت چه بود
فریاد بر آورد که دُر دُر موئے
یا
چومن طوطیٔ هندیم از راست پُرسی
زمن هندوی پُرس تا نغز گویم

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خسرو خود کو 'طوطیٔ ہند' کہنے اور 'ہندوی' میں بات کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ 'تانغز گویم' سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خسرو اپنی مادری زبان میں اپنے جذبات و احساسات کا اظہار فارسی کے مقابلے میں زیادہ آسانی سے کر سکتے ہیں۔ یہی نہیں ایک جگہ انہوں نے اپنی پدری زبان ترکی اور فارسی پر ہندوی کو ترجیح دی ہے۔

اثبات گفت هندبه حجت که راجح است
برپارسی و ترکی از الفاظ خوش گوار
ترک هندوستانیم من هندوئ گویم چوآب
شکرِ مصری نه دارم کز عرب گویم سخن

امیر خسرو کی شگفتہ دلی، طبعی فطرت، ملنسار طبیعت اور باذوق دل نے عوام کی تفریح کے لیے ایسے لوک ادب کو جنم دیا جو ایک درویش اور درباری کو عام زندگی کے درمیان لے آتا ہے۔ یہ وہ سطحِ زمین ہے، جہاں ایک عظیم شاعر، مصاحب، ندیم اور عام۔ عوام کے قہقہوں کا شور ایک ہوجاتا ہے، جو اس کی مقبولیت کا راز ہے۔ تخلیقی ادب میں عوامی زبان کے استعمال کی ابتدا امیر خسرو نے ہی کی ہے۔ آج جسے ہم 'قومی زبان' کہتے ہیں اس کی بنیاد بھی خسرو نے ہی رکھی تھی۔ ان کی وطن دوستی تمام زبانوں مثلاً ہندوی، سندھی، لاہوری، کشمیری، کنری، دھورسمندری، تلنگی، گجری، معبری، گوری، بنگالی، اودھی اور سنسکرت سب کو گلے لگاتی ہے۔ ان سب زبانوں میں سنسکرت کو افضل تر بلکہ فارسی سے برتر قرار دیا ہے۔ البتہ عربی سے اس کو بہتر نہیں سمجھتے۔ 'دول رانی خضر خاں' میں کہتے ہیں کہ ہندوستانی زبان فارسی زبان سے کم تر نہیں (۹)

غلط کردم گر از دانش زنی دم
نه لفظِ هندیست از پارسی کم

ہمیں معلوم ہے کہ اس زمانے میں 'ہندوی' کی حیثیت کیا تھی، لیکن خسرو کی دوربیں نگاہوں نے اس زبان کے مستقبل کو دیکھ لیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ نوزائیدہ زبان میں فارسی سے زیادہ امکانات موجود ہیں۔ سوائے عربی زبان کے جو تمام زبانوں پر حکمراں ہے، باقی بیشتر زبانوں پر اس کو فوقیت حاصل ہے۔ ''جو شخص علم کا مدعی ہے اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہندی

امیر خسرو نے ہندو مذہب کے فکر وفلسفہ کا بڑی باریک بینی سے مطالعہ کیا تھا۔ انہوں نے 'سپہر' میں دونوں مذاہب کے اشتراک و امتیاز پر روشنی ڈالی ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ ان کی شخصیت میں ہندی اور وسط ایشیائی تہذیب و ثقافت کا امتزاج پیدا ہوگیا تھا۔ اسی امتزاجی رویّے کے تحت انہوں نے مذہب اسلام اور ہندومت میں مشابہتوں اور مفاہمتوں کی راہ تلاش کی تھی۔ عالمانہ سطح پر دونوں مذاہب کے درمیان ممکنہ حد تک تضادات کی خلیج کو پاٹنے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔

صرف ونحو کے اصول وقواعد عربی کی طرح منضبط ہیں۔ جہاں تک معانی و خیالات کی بات ہے تو دوسری زبانوں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔''

و گر پُرسی نیابش از معانی
در آں نیز از دگرها کم ندانی (۱۰)

آج خسرو کی یہ پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی۔ زبان کے تعلق سے خسرو کی یہ ناقابلِ فراموش عطا ہے۔

امیر خسرو نے ہندو مذہب کے فکر وفلسفہ کا بڑی باریک بینی سے مطالعہ کیا تھا۔ انہوں نے 'سپہر' میں دونوں مذاہب کے اشتراک و امتیاز پر روشنی ڈالی ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ ان کی شخصیت میں ہندی اور وسط ایشیائی تہذیب وثقافت کا امتزاج پیدا ہوگیا تھا۔ اسی امتزاجی رویّے کے تحت انہوں نے مذہب اسلام اور ہندومت میں مشابہتوں اور مفاہمتوں کی راہ تلاش کی تھی۔ عالمانہ سطح پر دونوں مذاہب کے درمیان ممکنہ حد تک تضادات کی خلیج کو پاٹنے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ بنیادی بات یہ ہے کہ ان کی شخصیت میں ہندی اور وسط ایشیائی تہذیب وثقافت کا امتزاج پیدا ہوگیا تھا۔ اسی امتزاجی رویّے کے تحت انہوں نے مذہب اسلام اور ہندومت میں مشابہتوں اور مفاہمتوں کی راہ تلاش کی تھی۔ عالمانہ سطح پر دونوں مذاہب کے درمیان ممکنہ حد تک تضادات کی خلیج کو پاٹنے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ بنیادی بات یہ ہے کہ ہندوستان میں بھائی چارہ کی ایک نئی تہذیب جنم لے۔ وہ اس لیے کہ صوفی ازم کی وحدانیت اور ویدک دھرم کی وحدانیت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ توحید کی راہ سمجھداری اور ہم آہنگی کی ہے۔ اسی لیے ہندوستان میں روح اور روح مطلق کے درمیان روحانی اسلحوں کی ایجاد کی گئی ہے۔ ہمارے جنگلوں سے جنگ جنگ پکارتے درندے نہیں، شانتی شانتی کا پیغام دیتے سادھوسنت اور درویش نکلتے ہیں۔

معترفِ وحدت و هستی و قدم
قدرتِ ایجاد همه بعد عدم
خالق افعال به نیکی و بدی
حکمت و حکمش ازلی و ابدی
فاعلِ مختار و مجازی به عمل
عالمِ هر کلی و جزوی ز ازل

یہی نہیں ہندو مذہب کا موازنہ و تقابل دوسرے مذاہب سے کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس کو مذہبِ اسلام کے علاوہ تمام مذاہب پر

امتیاز حاصل ہے۔ سچّی، پکّی اور اصلی بات یہ ہے کہ امیر خسرو ہندوؤں اور مسلمانوں کو قریب دیکھنا چاہتے تھے اور بس۔

کافرِ عشقم مسلمانی مرا در کار نیست
ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنّار نیست
خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند
آرے آرے می کنم یا خلق و عالم کار نیست

اس عہد کے درباروں اور صوفی سنتوں کے یہاں منعقد محفلوں کی جان امیر خسرو موسیقی کے شہنشاہ مانے جاتے تھے۔ موسیقی کے شعبے میں خسرو نے ترکی، ایرانی اور ہندوستانی راگوں کے اشتراک سے ترانہ، خیال، نقش، نگار، بسیط، تلانہ اور سہیلا جیسے دلکش راگوں کی ایجاد کی اور عرفان وطہارت کا رنگ دے دیا۔ امیر خسرو کی دین قوالی بھی ہے۔ اس کے درون میں ایرانی، عربی اور شمالی ہندوستانی موسیقی کی آواز موجود ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ وسائل کچھ بھی ہوں شرط اشتراک و انضمام ہے۔ خواہ وہ موسیقی ہی کیوں نہ ہو۔

ہندوستان دنیا کی سب سے قدیم اور بڑی تہذیب کا مرکز رہا ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تہذیبیں تنگ دل نہیں فراخ دل ہوتی ہیں، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اسے فراخ دلی اور کشادہ ذہنی عطا کرنے میں ہندوستانی صوفی سنتوں نے اہم رول ادا کیا، جس کا سلسلہ آج بھی جاری وساری ہے۔ عہد وسطیٰ میں تہذیبی اشتراک کے احساس سے متاثر ہوکر جن صوفی سنتوں نے جذباتی سطح پر اتحاد کی راہ آسان کی ان مخلص، درد مند، روادار اور انسان دوست صوفی سنتوں کے سلسلہ میں امیر خسرو 'امیر' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی عقیدتی شاعری نے ان کے بعد آنے والے ہندوستان کے بعض روحانی رہنماؤں کو شاعرانہ وجدان اور تخلیقی تحریک مہیا کی جیسے بابا گرونانک، بھگت کبیر، سنت نام دیو، بلّھے شاہ، وارث شاہ،، شاہ عبداللطیف بھٹائی، جنہو ں نے ہندوستان کی کئی نسلوں کو روحانی تاثیر سے فیضیاب کیا اور مختلف مذاہب اور عقیدے کے لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب لاکر ہم آغوش کیا اور انہیں روحانی اتحاد کی ایک لڑی میں پرو دیا۔

عہدِ موجود میں بھی خسرو کی زندگی اور ادب و شاعری جذباتی سطح پر ہندوستانیوں کو جوڑنے میں ایک ڈور کا کام کرے گی۔ یعنی خسرو کی رواداری، انسان دوستی، وطن پرستی اور اتحاد و اشتراک کا تصور آج بھی بامعنی ہے جبکہ کل سے زیادہ آج ملک کو اس کی ضرورت ہے۔ ایسے میں امیر خسرو کی وسیع المشربی، وطن دوستی، فراخ دلی اور کشادہ ذہنی کو عام کیا جائے۔ دوسرے یہ

> ہندوستان دنیا کی سب سے قدیم اور بڑی تہذیب کا مرکز رہا ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تہذیبیں تنگ دل نہیں فراخ دل ہوتی ہیں، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اسے فراخ دلی اور کشادہ ذہنی عطا کرنے میں ہندوستانی صوفی سنتوں نے اہم رول ادا کیا، جس کا سلسلہ آج بھی جاری وساری ہے۔ عہد وسطیٰ میں تہذیبی اشتراک کے احساس سے متاثر ہوکر جن صوفی سنتوں نے جذباتی سطح پر اتحاد کی راہ آسان کی ان مخلص، دردمند، روادار اور انسان دوست صوفی سنتوں کے سلسلہ میں امیر خسرو 'امیر' کی حیثیت رکھتے ہیں۔

کہ جب یہ ملک ہمارا اور ہم سب کا ہے، یہیں جینا اور مرنا ہے، تو کیوں نہ ہندوستان اور اس میں رہنے اور بسنے والی چیزوں سے محبت کریں۔ محبوب ومحب کی طرح چاہیں اور چاہے جائیں۔ ایک دوسرے کے مذہبی عقائد وفکر کا احترام کریں۔ جس سے ہندوستان پرست رنگیں قوس وقزح پھیلی ملے۔ ہواؤں، فضاؤں اور موسموں میں اذانوں کے ساتھ درویشوں کی آوازوں میں رچ بس کر بودھ پرارتھناؤں، عیسائی کوئر اور انہیں میں ملی جلی مندروں کے گھنٹوں اور گرودواروں سے اٹھتی خوشبو میں گھلی آواز عبادت کی ہو۔ اسی میں ہندوستان کی اور ہم سب کی بھلائی ہے۔ یہ وقت، حالات، زمانہ کا تقاضہ اور بڑی ضرورت ہے۔ یہی خسرو کی خواہش اور ان سے عقیدت کا سب سے بڑا نذرانہ بھی ہے۔

(۱) امیر خسرو مرتب شیخ سلیم احمد (مضمون: تاراچند) ص ۳۴۵، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۰۶

(۲) امیر خسرو اور ہندوستان، ڈاکٹر تاراچند، ص ۶، امیر خسرو اکیڈمی، نئی دہلی ۱۹۶۲

(۳) خسرو شناسی، مرتب ظ انصاری، ابوالفیض سحر ص ۸۸، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ۲۰۱۰

(۴) خسرو شناسی، مرتب ظ انصاری، ابوالفیض سحر، ص ۸۸، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ۲۰۱۰

(۵) خسرو شناسی، مرتب ظ انصاری، ابوالفیض سحر ص ۸۸، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ۲۰۱۰

(۶) امیر خسرو اور ہندوستان، ڈاکٹر تاراچند، ص ۶، امیر خسرو اکیڈمی، نئی دہلی ۱۹۶۲

(۷) امیر خسرو۔ عہد، فن اور شخصیت، عرش ملسیانی، ص ۷۰، مرکز تصنیف وتالیف، نکودر ۱۹۷۴

(۸) امیر خسرو۔ عہد، فن اور شخصیت، عرش ملسیانی، ص ۷۰، مرکز تصنیف وتالیف، نکودر ۱۹۷۴

(۹) خسرو شناسی، مرتب ظ انصاری، ابوالفیض سحر، ص ۹۱، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ۲۰۱۰

(۱۰) امیر خسرو: احوال و آثار، مرتب نور الحسن انصاری، ص ۲۶۶، ۲۲۷، مکتبہ شاہ راہ، دہلی ۱۹۷۵

❑❑❑

غزل

ذہن کو میرے جگا فکر کو مشکبار کر
اپنی نوازشات کو اور بھی بے کنار کر

بزم تصورات میں برق شکار بن کے آ
میرا ہر ایک زمزمہ نغمۂ شاہکار کر

قلب میں جو مکین ہے وہ جو بہت حسین ہے
اس پہ ہی دل کو وار دے اسی پہ ہی جاں نثار کر

عظمت وشان وذات کی یہ بشری صفات ہیں
غازۂ عجز رُخ پہ مل طبع کو خاکسار کر

بڑھ کے اٹھالے ہاتھ میں جامِ مئے نشاطِ وقت
خود کو خوشی کے ساتھ ساتھ نذرِ نگاہِ یار کر

سچ تو ہے رخشِ عمر کی چال کا اعتبار کیا
جانے یہ رقصِ زندگی رکھ دے کہاں اتار کر

نغمۂ جاں نواز کی تاب نہ لا سکے گا یہ
نظم خزاں کو یوں نہ اب شرمندۂ بہار کر

سلمیٰ شاہین
Rz 2677A/28، نیو ہاریزان اپارٹمنٹ، تغلق آباد ایکسٹینشن، نئی دہلی-۱۹
موبائل: 9971824933

غزل

مجھ کو شب فراق کا غم یاد آ گیا
آنے کو نیند تھی کہ صنم یاد آ گیا

مرجھا نہ جائے میرے تصور کا گلستاں
مہکا ہوا وہ باغ ارم یاد آ گیا

آنکھوں میں اشک پھول سے چہرے پہ تھی ہنسی
اک ہمنوا کا دامن غم یاد آ گیا

وہ جام وہ سرور وہ مستی وہ میکدہ
ساقی کا دل نواز کرم یاد آ گیا

بدلے گا وقت آئے گی پھر سے حسین رات
لوگوں کے ذہن کا وہ بھرم یاد آ گیا

توبہ شکن یہ زہد یہ رندی یہ پیرہن
پل بھر میں وہ توڑنا وہ ستم یاد آ گیا

ہنسنے کی کوششوں میں تھا مصروف آفتابؔ
اس بے وفا کا زورِ ستم یاد آ گیا

آفتاب احمد خاں
A-1/1662/426، عینی منزل کے سامنے، وزیر باغ، لکھنؤ
موبائل: 9451309784

عدم گناہ

شموئل احمد
301، گرینڈ اپارٹمنٹ، نیو پاٹلی پتر کالونی، پٹنہ
موبائل: 9835299303

اس کا دماغ سن سے رہ گیا۔ زمین پاؤں تلے کھسک گئی۔ ڈھائی لاکھ کا غبن۔ وہ سر تھام کر بیٹھ گیا۔ منٹوں میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ اکاؤنٹس کلرک محمد شریف نے ڈھائی لاکھ کا غبن کیا ہے۔ کسی کو یقین نہیں آیا کہ یہ کام اسی کا ہے، لیکن کمپنی کے لیجر بک میں اس کا نام درج تھا اور کیش رول (Cash Roll) میں وصول کنندہ کی جگہ اس کا دستخط موجود تھا، منیجر کی میز پر کیش رول کھلا پڑا تھا۔ محمد شریف کمرے میں داخل ہوا تو منیجر نے چشمے کے اندر سے گھور کر دیکھا۔

''دستخط تو آپ کے ہیں۔۔۔؟''

دستخط اسی کے تھے منیجر کا لہجہ سخت ہو گیا۔

''آپ کو ایک ہفتہ کی مہلت دی جاتی ہے۔ رقم جمع کر دیں ورنہ۔۔۔''

محمد شریف پر لرزہ طاری تھا۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں تھا۔ کسی طرح لڑکھڑاتا ہوا منیجر کے کمرے سے باہر نکلا تو عملے نے اس کو گھیر لیا۔

''یہ سب کیسے ہوا۔؟

''شریف کی زبان گنگ تھی۔

اکاؤنٹنٹ نے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔:

''شریف کچھ بتاؤ گے۔؟'' شریف روہانسا ہو گیا۔ اس کے منھ سے بہ مشکل نکلا:

''رقم میں نے نہیں لی۔۔۔''

''ہمیں یقین ہے'' اکاؤنٹنٹ نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

''یہ اس کیشیئر کی کارستانی ہے۔۔۔'' کسی نے کہا تو شریف نے چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ شریف کے آنسو تھمے تو تفصیل بتائی کہ نلنی کنسٹرکشن والوں نے ڈھائی لاکھ کا ڈرافٹ بھیجا تھا جس کی نکاسی بینک سے ہونی تھی۔ اس دن کیشیئر چھٹی پر تھا۔ منیجر نے ڈرافٹ اس کے حوالے کیا تھا لیکن کسی وجہ سے اس دن بینک نہیں جا سکا اور دوسرے دن کیشیئر چھٹی سے واپس آ گیا تھا۔ کیشئر نے یہ کہہ کر ڈرافٹ لے لیا تھا کہ اکاؤنٹ میں لے لے گا۔

''اور اس نے غبن کر لیا۔۔۔'' اکاؤنٹنٹ بولا۔

شریف نے اثبات میں سر ہلایا۔

> دفتر سے نکلنے کے بعد اچانک اس کو احساس ہوا کہ اس کے کندھے پر ایک صلیب ہے جسے ڈھوتے ہوئے وہ دار و رسن کی طرف بڑھ رہا ہے۔ جب تک دفتر میں تھا، ایسا عجیب سا احساس نہیں ہوا تھا۔ وہاں دوستوں کو تفصیل بتانے میں الجھا رہا تھا اور جب اس کے ساتھی ایک ایک کر کے چلے گئے تھے تو جانا کہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اس کے قدم گھر کی طرف نہیں بڑھ پا رہے تھے۔ ہارڈنگ پارک کے قریب قدم خود بخود رک گئے۔ پارک میں اکا دکا لوگ موجود تھے۔ ایک لڑکا بیلون اچھال رہا تھا اور ایک جوڑا بنچ پر بیٹھا خوش گپیاں کر رہا تھا۔

''لیکن تم نے کیش رول پر دستخط کیوں کیے۔'

اس نے کہا کہ اتھارٹی میرے نام ہے اس لئے دستخط بھی مجھے کرنا چاہئے۔''

''اور تم نے کر دیا۔؟''

''میں کیا جانتا تھا کہ نیت میں فتور ہے۔!''

اس نے بینک والوں سے مل کر کسی طرح ڈرافٹ کیش کرا لیا اور تم پھنس گئے۔''

''لیکن بینک میں اس کا دستخط تو ہوگا۔۔۔!''

''اس سے کیا ہوا۔۔۔؟ اس نے رقم نکالی اور تم کو دے دی۔ اتھارٹی لیٹر تمہارے نام ہے۔ وصول کنندہ کی جگہ تم نے دستخط کئے ہیں۔۔۔''

''اب کیا ہوگا۔؟'' شریف پھر روہانسا ہو گیا۔

''رقم تو جمع کرنی ہوگی۔۔۔

''شریف کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔

عملے کو یقین تھا کہ غبن سابق کیشیئر نے کیا ہے۔ محمد شریف سے سبھی واقف تھے۔ وہ ایماندار اور بے ضرر آدمی تھا اور صرف اپنے کام سے مطلب رکھتا تھا۔ لیکن کیشیئر سے باز پرس مشکل تھی۔ وہ کمپنی سے استعفا دے کر کہیں فرار ہو گیا تھا اور الزام محمد شریف کے سر تھا۔ محمد شریف کے ساتھی دلاسہ دے رہے تھے کہ کسی طرح کیشیئر کو ڈھونڈ کر رقم وصول کی جائے گی، لیکن اس پر لرزہ طاری تھا اور رہ رہ کر ایک ہی خیال سانپ کی طرح ڈس رہا تھا۔۔۔ ''اب کیا ہوگا۔؟ وہ پولیس کی حراست میں ہوگا اور بیوی بچے۔۔۔''

دفتر سے نکلنے کے بعد اچانک اس کو احساس ہوا کہ اس کے کندھے پر ایک صلیب ہے جسے ڈھوتے ہوئے وہ دار و رسن کی طرف بڑھ رہا ہے۔ جب تک دفتر میں تھا، ایسا عجیب سا احساس نہیں ہوا تھا۔ وہاں دوستوں کو تفصیل بتانے میں الجھا رہا تھا اور جب اس کے ساتھی ایک ایک کر کے چلے گئے تھے تو جانا کہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اس کے قدم گھر کی طرف نہیں بڑھ پا رہے تھے۔ ہارڈنگ پارک کے قریب قدم خود بخود رک گئے۔ پارک میں اکا دکا لوگ موجود تھے۔ ایک لڑکا بیلون اچھال رہا تھا اور ایک جوڑا بنچ پر بیٹھا خوش گپیاں کر رہا تھا۔ قریب ہی ایک ادھیڑ عمر کا شخص گھاس پر چپ چاپ لیٹا آسمان تک رہا تھا۔ اس کو لگا یہ شخص بھی کسی دفتر میں ملازم ہے اور اس وقت گھر جانا نہیں چاہتا۔

اچانک اس کی نگاہوں میں کیشیئر کا مکروہ چہرہ گھوم گیا۔! کس چالاکی سے اس نے کیش رول پر دستخط لئے تھے۔۔۔ پہلے کینٹین میں چائے پلائی تھی۔ پھر میٹھی میٹھی باتیں کی تھیں اور وہ اس کے فریب میں آ گیا تھا۔ اگر اس دن دفتر نہیں گیا ہوتا منیجر اس کے نام اتھاریٹی لیٹر کیوں لکھتا۔؟ اب کیا ہوگا۔؟ کہاں سے لائے گا وہ ڈھائی لاکھ کی رقم؟ اس کے پاس جائداد بھی نہیں ہے۔ بیوی کے پاس اتنے زیور بھی نہیں ہیں کہ بیچ کر رقم چکتا کر سکے۔

اس نے اداس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ پارک میں کچھ اور لوگ آ گئے تھے۔ جوڑا اسی طرح خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ دفعتاً اس کو محسوس ہوا کہ ہر چیز لایعنیت کے کہرے میں لپٹی ہوئی ہے۔۔۔ یہ جوڑا بھی خوش گپیوں میں مصروف ہے۔۔۔۔ کل حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہوگا۔ آدمی غفلت میں ہوتا ہے، ستم ظریفی گھات میں ہوتی ہے۔۔۔۔ عمر کی کسی نہ کسی منزل پر دبوچ لیتی ہے۔ یہ قسمت کی ستم ظریفی ہی تو ہے کہ اس نے کیش رول پر۔۔۔۔

گھاس پر لیٹے ہوئے ادھیڑ عمر شخص نے سرد آہ کے ساتھ کروٹ بدلی۔ ایک ہاتھ موڑ کر سر کے نیچے تکیہ سا بنایا اور آنکھیں بند کر لیں۔۔۔۔ اس نے غور سے دیکھا ۔۔۔۔ چہرے پر تفکر کے آثار تھے۔۔۔۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی بال خشک ہو رہے تھے اور قمیض کا کالر کنارے کی طرف مڑا ہوا تھا۔ اس کو لگا گھاس پر ادھ مرا لیٹا ہوا شخص کوئی اور نہیں خود وہ ہے۔۔۔۔ دفتری نظام کے شکنجے میں پھنسا ہوا۔۔۔۔ بے بس اور تنہا۔۔۔۔ جی میں آیا قریب جائے اور اس کے کندھے پر سر رکھ دے۔۔۔۔ تب اس کو اپنی آنکھیں نمناک محسوس ہوئیں۔ اس نے انگلیوں

یہ اس کا معمول نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ دفتر سے سیدھا گھر آتا تھا۔ آج پہلی بار اس نے تاخیر کی تھی اور اتنا غم زدہ تھا کہ اس کے چہرے سے پژمردگی صاف جھلک رہی تھی۔ اپنے حال پر پردہ ڈالنے کے لئے فوراً ہاتھ منہ دھونے بیٹھ گیا۔ دو چار چھینٹے چہرے پر مارے اور تولیہ سے چہرہ خشک کرتا ہوا کھانے کی میز پر آیا تو بیوی نے پھر ٹوکا کہ آخر کیا بات تھی کہ وہ اتنا چپ چپ تھا۔ اس نے اسی طرح مختصر سا جواب دیا کہ آج کام زیادہ تھا جس سے تھکاوٹ پیدا ہوگئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے بتائے معاملہ کیا ہے؟

سے آنسو خشک کئے۔۔۔۔ سرد آہ کھینچی اور گھاس پر لیٹ گیا۔

شام گہری ہونے لگی۔ تارے ایک ایک کر کے روشن ہو گئے تھے۔ پارک میں بلب کے چاروں طرف گردش کرتے پروانوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ لوگ اب آہستہ آہستہ جانے لگے تھے لیکن وہ اسی گھاس پر پڑا رہا۔ یہاں تک کہ سڑکوں پر ٹریفک کا شور مدھم ہونے لگا۔ سب چلے گئے تو ادھ مرا شخص بھی اٹھا۔ اس کے دامن سے ایک تنکا چپک گیا تھا۔ اس نے گرد بھی نہیں جھاڑی اور پژمردہ قدموں سے باہر نکل گیا۔۔۔۔ اور پارک میں سناٹا اچانک بڑھ گیا۔ اس کو دہشت ہوئی اور گھر کی یاد آئی۔ وہ اٹھا اور شکستہ قدموں سے گھر کی طرف چل پڑا۔ بیوی انتظار کر رہی تھی۔ دیکھتے ہی برس پڑی۔ پھر اس کو گم صم دیکھ کر گھبرا گئی۔ وہ بس اتنا ہی کہہ سکا کہ دفتر میں دیر ہو گئی، لیکن بیوی کو اطمینان نہیں ہوا۔

یہ اس کا معمول نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ دفتر سے سیدھا گھر آتا تھا۔ آج پہلی بار اس نے تاخیر کی تھی اور اتنا غم زدہ تھا کہ اس کے چہرے سے پژمردگی صاف جھلک رہی تھی۔ اپنے حال پر پردہ ڈالنے کے لئے فوراً ہاتھ منہ دھونے بیٹھ گیا۔ دو چار چھینٹے چہرے پر مارے اور تولیہ سے چہرہ خشک کرتا ہوا کھانے کی میز پر آیا تو بیوی نے پھر ٹوکا کہ آخر کیا بات تھی کہ وہ اتنا چپ چپ تھا۔ اس نے اسی طرح مختصر سا جواب دیا کہ آج کام زیادہ تھا جس سے تھکاوٹ پیدا ہو گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے بتائے معاملہ کیا ہے۔۔۔؟ کسی طرح اس نے دو چار لقمہ زہر مار کیا اور کمرے میں آ کر بستر پر دراز ہو گیا۔ منّا ایک طرف سو رہا تھا۔ وہ گہری نیند میں تھا۔

اس کی مٹھیاں ادھ کھلی تھیں اور چہرے پر بھینی بھینی سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے منّے کے سر پر آہستہ سے ہاتھ پھیرا۔ اس کی آنکھیں بھیگ آئیں۔ تکیے میں منہ چھپا کر آنسو خشک کئے اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ اس کو اکاؤنٹنٹ کی بات یاد آئی۔۔۔۔ رقم جمع کرنی ہوگی۔۔۔۔ یہ تحریری نظام کا جبر۔۔۔۔ اس نے غبن نہیں کیا لیکن سزا جھیلنے پر مجبور ہے۔۔۔۔ کہاں سے لائے گا رقم۔۔۔۔؟ کون ہے جو مدد کرے گا۔۔۔۔؟ کیا وہ لوگ کیشیئر کو ڈھونڈ پائیں گے۔۔۔۔؟ یہ کہنے کی باتیں ہیں کوئی اتنا جوکھم کیوں اٹھائے گا۔۔۔۔؟ اور کیشیئر اپنا جرم کیوں قبول کرے گا۔۔۔۔؟ اس نے غبن اس لئے تو نہیں کیا کہ خود کو گناہ گار ثابت کرے؟ یہ سزا تو اس کو

بھگتنی ہے..... وہ بچ نہیں سکتا.....اس کا دستخط موجود ہے.....دستخط ..... فقط چند حروف اور ایک جھوٹ صداقت میں بدل گیا۔شاید سچ اور جھوٹ ایک ہی سکّے کے دو پہلو ہیں.....جھوٹ کی بھی اپنی ایک سچائی ہے۔کیش رول میں اس کا دستخط ایک سچّائی ہے جس نے مجرم محمد شریف کو جنم دیا.....اس کے دستخط کی سچائی مجرم محمد شریف کو مرنے نہیں دے گی.....اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ پھیل گئی.....کیا ہوا اگر دستخط کر کے مرجائے کہ اس کی موت کی ذمہ دار اس کی بیوی ہے۔

بیچاری وفا شعار عورت.....فوراً قاتل قرار دی جائے گی ..... یہ سوچ کر مرجائے گی کہ اس سے ایسی کون سی خطا سرزد ہوئی کہ شوہر بے موت مرگیا .....بچے بھی اس کو قاتل سمجھیں گے.....وہ زندگی بھر ثابت نہیں کرسکتی کہ وہ بے قصور ہے۔ بس چند حروف..... اور وہ شکنجے میں ہوگی..... ناکردہ گناہ کی مرتکب.....آدمی قدرت کے نظام میں آزاد ہے،لیکن اپنے ہی نظام میں اسیر ہے .....بس ایک معمولی سا دستخط.....''دستخط تو آپ ہی کے ہیں.....''اس کے جی میں آیا زور سے چلّائے .....جی ہاں دستخط میرے ہیں .....سو فی صد میرے ہیں.....میں اپنے دستخط کی سچائی کا اسیر ہوں جس کا شکنجہ موت کے شکنجے سے زیادہ اذیت ناک ہے.....!بیوی پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔اس کے دل میں درد کی لہر سی اٹھی ۔کیا وہ بھی اس پر شک کرے گی .....؟اس کی رفیقۂ حیات جو دس سالوں سے اس کے ساتھ ہے.....؟اس نے تکیہ کو سینے پر رکھ کر دبایا اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ شک کرسکتی ہے .....تنگ دست آدمی کا ایمان ہمیشہ مشکوک ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت ہی کیا ہے .....؟ پرائیوٹ فرم کا ایک معمولی سا اکاؤنٹس کلرک.....؟ ڈھائی روپے نہیں لے گا۔ ڈھائی ہزار نہیں لے گا .....؟ کیا ڈھائی لاکھ بھی نہیں لے گا.....؟

بیچاری وفا شعار عورت.....فوراً قاتل قرار دی جائے گی۔ یہ سوچ کر مرجائے گی کہ اس سے ایسی کون سی خطا سرزد ہوئی کہ شوہر بے موت مرگیا..... بچے بھی اس کو قاتل سمجھیں گے.....وہ زندگی بھر ثابت نہیں کرسکتی کہ وہ بے قصور ہے۔ بس چند حروف.....اور وہ شکنجے میں ہوگی.....ناکردہ گناہ کی مرتکب.....آدمی قدرت کے نظام میں آزاد ہے، لیکن اپنے ہی نظام میں اسیر ہے .....بس ایک معمولی سا دستخط.....''دستخط تو آپ ہی کے ہیں.....'' اس کے جی میں آیا زور سے چلّائے۔ جی ہاں دستخط میرے ہیں.....سو فی صد میرے ہیں۔

اس نے ایک نظر بیوی کی طرف دیکھا ۔ اس کے بال کھلے تھے اور چہرے پر تازگی تھی ۔ غالباً اس نے شام کو غسل کیا تھا۔ جب بھی شام کو غسل کرتی، بال کھلے رکھتی تھی، جو لمبے تھے اور کمر تک لہراتے تھے ۔ اس نے ہاتھوں کو پیچھے لے جا کر ایک بار بال کی تہوں کو سلجھایا۔اس کے سینے کے ابھار نمایاں ہو گئے اور سپید گردن تن گئی جس پر ابھی جھریاں نہیں پڑی تھیں ۔اس نے بالوں کو سمیٹ کر جوڑا بنایا اور منّے کو اٹھانے کے لئے بستر پر جھکی تو اس کا آنچک ڈھلک گیا اور کان کے آویزے ہل کر رہ گئے ۔ منّے کو بازوؤں سے پکڑ کر اس نے آہستہ سے بستر کے کنارے کھینچا۔ پھر تکیے کا اوٹ سا بنایا اور بغل میں لیٹ گئی۔

وہ یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکا کہ اس کا اس طرح اپنے لئے جگہ بنانا یقیناً بے مقصد نہیں تھا۔اس نے اکثر ایسا کیا تھا۔تب وہ بھی اس کی طرف رجوع ہوتا تھا اور اس کی آنکھوں میں آتشیں لہروں کی تحریر صاف پڑھ لیتا تھا ورنہ عام دنوں میں منّا بیچ میں ہوتا تھا اور وہ دوسرے کنارے پر سوتی تھی ۔ بیوی نے ایک ہاتھ کو جنبش دی اور وہ کمر کے گرد اس کی انگلیوں کا ہلکا سا لمس محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکا ۔ اس کو یاد آیا بیوی کو چار مہینے کا حمل بھی ہے ۔ وہ تھوڑا قریب کھسک آئی ۔ یہاں تک کہ وہ اپنے رخساروں پر اس کی گرم سانسوں کو محسوس کرنے لگا۔اس کے دل میں ٹیس سی اٹھی ۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''کیا بات ہے.....؟'' بیوی نے تکیے سے سر اٹھایا۔

وہ خاموش رہا۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے.....؟''

''پانی پلاؤ.....''

بیوی نے اٹھ کر کمرے میں روشنی کی ۔اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ کے آثار بہت نمایاں تھے ۔اس کا جوڑا کھل گیا تھا اور گیسو بکھر گئے تھے ۔ ساری بے ترتیب ہوگئی تھی جس سے پیٹ کا ابھار نمایاں ہو گیا تھا۔

وہ پانی لانے کچن میں گئی تو اس نے دیکھا وہ کولھوں پر زور دے کر چل رہی تھی ۔ ساری کی بے ترتیبی سے پیٹی کوٹ کے نیفے میں جوڑ کے قریب گلابی ڈور کا بہت خفیف سا حصہ جھلک رہا تھا۔اس نے گہری سانس لی اور چت لیٹ گیا۔

اس کو چاہئے کہ سب کچھ بتا دے ..... دل کا بوجھ تو کچھ کم ہوگا.....لیکن وہ گھبرا جائے گی اور کچھ کر بھی تو نہیں سکتی.....وہ بھی کیا کرسکتا ہے.....؟ وہ بھی تو کچھ نہیں کرسکتا.....بیوی کم سے کم دعا مانگ سکتی ہے..... فوراً نماز میں کھڑی ہوجائے گی .....سجدے میں گر پڑے گی ..... رو رو کر فریاد کرے گی .....اس کو امید ہوگی کہ کوئی معجزہ ہوگا.....خدا سن لے گا.....خدا بڑا رحم والا ہے.....سب راز کا جاننے والا ہے.....اس کا دل عقیدے کی روشنی سے معمور ہے اس لئے امید کی کرن آخری دم تک اس کا ساتھ نہیں چھوڑے گی.....اس کے جیل جانے کے بعد بھی وہ یہی سمجھے گی کہ اس میں خدا کی کوئی مصلحت ہے..... جینے کے لئے ضروری ہے

کہ آدمی عقیدے کا بھرم پالے.....لیکن اس کا ایمان تو ہمیشہ متزلزل رہا.....عقیدے کی روشنی کبھی پھوٹ نہیں سکی.....وہ تو خدا سے دعا بھی نہیں مانگ سکتا.....وہ کسی معجزے کی امید نہیں کرسکتا.....وہ خود کو تسلی نہیں دے سکتا کہ خدا سب کچھ دیکھ رہا ہے انصاف کرے گا۔۔۔ وہ سچائی پر ہے اور سچائی کی جیت ہوگی ..... اس کے پاس امید کی کوئی کرن نہیں ہے۔۔۔اس کو حیرت ہوئی کہ واقعی اس کے پاس کوئی خدا نہیں ہے.....!

وہ کس سے دعا مانگے.....؟ کہاں ہے خدا۔۔۔؟ آسمانی صحیفوں میں۔۔۔؟ یا انسانی قلوب میں جاگزیں شہ رگ سے بھی قریب۔۔۔!

خدا جس کی خدائی میں ''عدم کو ثبات ہے۔ جس کے لوح وقلم میں محفوظ ہے۔ ہر ذی روح کے لئے ایک عدم گناہ کی سزا لیکن اس کو اپنا عدم گناہ قبول نہیں ہے، وہ کیوں اس جرم کی سزا قبول کرے جس کا مرتکب نہیں ۔رقم جمع کردیں ورنہ، ورنہ کیا؟ آپ پھانسی پر چڑھا دیں گے یہی نا؟ تو کون بری ہے تحریری نظام کے جبر سے؟

بہت ممکن ہے ایک فرد کا مچھلی کے پیٹ سے صحیح سلامت نکل آنا کہ یہ قدرت کا نظام ہے لیکن خود اپنے ہی نظام کے شکنجے سے چھوٹنا ممکن نہیں ہے کہ ''تحریری نظام'' میں حروف کی سچائی جس جھوٹ کو جنم دیتی ہے وہ خدا کی طرح زندہ جاوید ہے ۔ دستخط تو آپ کے ہی ۔ بے شک حضور والا ! دستخط میرے ہی ہیں ۔ میں کیش رول میں اسی طرح موجود ہوں جس طرح خدا آسمانی صحیفوں میں موجود ہے ۔ کیش رول میں میرے دستخط کی سچائی میرے عدم وجود کو وجود میں بدل چکی ہے ۔ میں ہمیشہ ہمیشہ وہاں موجود رہوں گا!

بیوی پانی لے کر آئی تو اس نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کردیا۔ بیوی نے پوچھا کہ اور چاہئے؟ تو اس نے نفی میں سر ہلایا اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ گلاس تپائی پر رکھ کر اس نے روشنی گل کی اور بستر پر لیٹ گئی ۔ وہ اپنی کمر کے گرد اس کے ہاتھوں کا لمس محسوس کرنے لگا۔ پھر وہ اور قریب کھسک آئی اور اس کے سینے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس کو اپنی بانہوں میں بھر چکا ہوتا لیکن اس وقت اس کا جی چاہ رہا تھا کہ مردے کی طرح چپ چاپ پڑا رہے اور کوئی اس

خدا جس کی خدائی میں ''عدم کو ثبات ہے۔ جس کے لوح وقلم میں محفوظ ہے۔ ہر ذی روح کے لئے ایک عدم گناہ کی سزا لیکن اس کو اپنا عدم گناہ قبول نہیں ہے، وہ کیوں اس جرم کی سزا قبول کرے جس کا مرتکب نہیں ۔رقم جمع کردیں ورنہ، ورنہ کیا؟ آپ پھانسی پر چڑھا دیں گے یہی نا؟ تو کون بری ہے تحریری نظام کے جبر سے؟

بہت ممکن ہے ایک فرد کا مچھلی کے پیٹ سے صحیح سلامت نکل آنا کہ یہ قدرت کا نظام ہے لیکن خود اپنے ہی نظام کے شکنجے سے چھوٹنا ممکن نہیں ہے کہ ''تحریری نظام'' میں حروف کی سچائی جس جھوٹ کو جنم دیتی ہے وہ خدا کی طرح زندہ جاوید ہے ۔ دستخط تو آپ کے ہی ۔ بے شک حضور والا ! دستخط میرے ہی ہیں ۔ میں کیش رول میں اسی طرح موجود ہوں جس طرح خدا آسمانی صحیفوں میں موجود ہے ۔ کیش رول میں میرے دستخط کی سچائی میرے عدم وجود کو وجود میں بدل چکی ہے ۔ میں ہمیشہ ہمیشہ وہاں موجود رہوں گا!

درمیان خلل نہیں ڈالے۔ اچانک منّا زور سے رو پڑا۔ وہ مڑی اور منّے کو فوراً بستر سے اٹھا کر فرش پر کھڑا کردیا لیکن فرش تک آتے آتے دو چار قطرہ پیشاب بستر پر خطا ہو ہی گیا۔ منّے کو فرش پر پیشاب کرانے کے بعد بستر پر لٹایا اور تھپکیاں دینے لگی۔

اچانک اس کو لگا دروازے پر کوئی دستک دے رہا ہے۔۔۔۔! اس کے کان کھڑے ہو گئے۔۔۔۔ دل میں آیا شاید دفتر کے ساتھی کیشیئر کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اس نے دروازہ کھولا ۔۔۔۔وہاں کوئی نہیں تھا۔۔۔۔! ایک لمحے کے لئے اس پر سکتہ سا طاری رہا اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

''خدا بے نیاز ہے اور آدمی پر امید۔۔۔۔''

اس کے جی میں آیا پوری قوت سے چلّائے۔۔۔''تمام دروازے بند کرلو، نہیں ہوگا کسی عیسیٰ کا ورود۔۔۔۔ آدمی اسی طرح خود ساختہ نظام کے شکنجے میں پھنسا رہے گا لیکن وہ چلّا نہیں سکا۔

اچانک اس کے سینے میں زور کا درد محسوس ہوا۔ دونوں ہاتھوں سے سینے کو پکڑے ہوئے اس نے کسی طرح دروازہ بند کیا اور لڑکھڑاتا ہوا بستر تک آیا۔ کانپتے ہاتھوں سے بیوی کے بازوؤں کو تھامنے کی کوشش کی ۔ اس کو سینے سے لگا کر بھینچا۔ بیوی کی چھاتیوں کے گداز لمس سے اس کو راحت ملی۔ اس نے اپنے رخسار اس کے رخسار پر ٹکا دیئے اور اس کی پشت کو زور زور سے سہلانے لگا جیسے اس کے بدن کے لمس سے اپنے لئے تھوڑی سی توانائی کسب کرنا چاہتا ہو۔ پیٹ کے اس حصے کے کڑے پن کو اس نے محسوس کرنے کی کوشش کی جہاں اس کا وجود پل رہا تھا۔ لیکن اچانک سینے میں درد بڑھ گیا۔ اس کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ جانکنی کے اس عالم میں اس کے جی میں آیا زور سے فریاد کرے۔

''میں اس جرم کی سزا کیوں قبول کروں جس کا مرتکب نہیں ہوں۔۔۔۔؟''

لیکن آواز اس کے سینے میں گھٹ کر رہ گئی۔ پھنسی پھنسی سی آواز میں وہ صرف دو بار بیوی کا نام لے کر پکار سکا۔۔۔۔سلطانہ۔۔۔۔سلطانہ۔۔۔۔!

اور اس کا سر سلطانہ کی چھاتیوں کے درمیان لڑھک گیا۔۔۔۔

❑❑❑

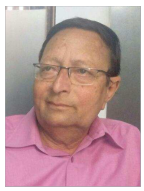

اسرار گاندھی
J/5 گلاب باڑی کالونی، الہ آباد
موبائل: 9335152371

غبار

میں نے اس سے ملنے کی خواہش اپنے میزبان سے ظاہر کی تھی۔

اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی جارہی تھی۔

میں اس کے انتظار میں تھا۔

کمرے میں موجود کئی لوگ مجھے دیکھ رہے تھے لیکن میں ان سب سے بے نیاز تیس برس پیچھے واپس جانے کے لئے جوجھ رہا تھا۔

تیس برس پہلے۔۔۔۔۔۔

اچانک یادوں کی دھند کے درمیان سے یوسف باہر نکل آیا۔ وہ میرے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔ رنگ گہرا سانولا، قد میانہ، سر پر گھنے کالے بال، تیکھا ناک نقشہ، آواز میں قدرے کھرا پن۔

''میں جاوید ہوں میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔''

''جی'' اس نے بڑی بے نیازی سے ہاتھ ملایا۔

اس نے اپنا نام بتانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مجھے کچھ اٹپٹا سا لگا۔

''آپ؟'' میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میں۔۔۔۔ میں ہوں۔'' وہ مسکراتا ہوا بولا۔

میرے چہرے پر جھنجھلاہٹ کے آثار پیدا ہو گئے۔ جیسے شاید اس نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ وہ جلدی سے بولا۔

''میں یوسف ہوں۔''

''اوہ! تو پھر آپ کی زلیخا بھی ہوں گی۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''ابھی پیدا نہیں ہوئی۔'' وہ ہنستا ہوا بولا۔

''آپ کا تعلق اسی شہر سے ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''نہیں قریب کے قصبے سے آیا ہوں۔''

''یہاں کہاں رہ رہے ہیں؟''

> ایک کے بعد دوسرا دن۔ دوسرے کے بعد تیسرا اور اسی طرح وقت گزرنے لگا۔ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ میں اور یوسف بھی کافی کچھ قریب آ گئے تھے، لیکن اس کے جملوں کی کڑواہٹ اور اس کے اکھڑ پن والے رویے اب بھی جیوں کے تیوں باقی تھے۔
>
> یہ شاید اس کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔
>
> میں نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ وہ اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں بات کرنے سے کتراتا ہے۔ میں نے پوری کوشش کی تھی کہ اس سے اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں کبھی نہ پوچھوں۔

''قریب ہی ایک کمرہ لے رکھا ہے اور آپ؟''

اس بار اس نے مجھ سے سوال کیا

''میں اسی شہر کا ہوں، یہاں میرا اپنا گھر ہے۔''

''اوہ! اچھا''

پھر اس سے پہلے کہ دوسری باتیں ہوتیں ہم دونوں کلاس کے لئے چل دئے۔ پروفیسر ارون گھوش کلاس میں پہنچ گئے تھے اور سال کے پہلے سیشن کا پہلا کلاس لینے جارہے تھے۔

پروفیسر ارون گھوش۔۔۔۔۔ تاریخ داں، بین الاقوامی شہرت کے مالک، قد چھوٹا، سر پر کالے گھنے بال، آنکھوں میں ذہانت کی چمک۔

بی۔اے۔ کے درجات میں بھی انھوں نے مجھے پڑھایا تھا، اس لئے کسی حد تک وہ مجھ سے واقف بھی تھے لیکن یہ واقفیت بے تکلفی کی حدوں میں کبھی داخل نہیں ہوئی۔

پینتالیس منٹ بعد کلاس ختم ہو گیا۔ میں اور یوسف کلاس روم سے باہر نکل آئے۔ اگلا پیریڈ خالی تھا۔ میں نے یوسف کو کینٹین چلنے کی دعوت دی۔ اس نے انکار کر دیا لیکن میرے بار بار کہنے پر راضی ہو گیا۔

کینٹین پہنچ کر اس نے اچانک کہا ''کل آپ مجھ سے بھی امید کریں گے کہ میں آپ کو یہاں لا کر چائے پلاؤں اور یہ میرے لئے مشکل ہوگا۔'' اس کی صاف گوئی پر مجھے حیرت ہوئی۔ وہ ذرا توقف سے پھر بولا۔

''میری عادت ہے کہ میں تعلقات بڑھانے سے پہلے اپنی حدوں کو واضح کر دیتا ہوں۔ لوگوں کو برا لگے یا نہ لگے لیکن میں بہت سی الجھنوں سے بچ جاتا ہوں۔''

یوسف کی یہ بات مجھے پسند آئی میں نے اسے یقین دلایا کہ میں دوسروں سے بہت الگ ہوں۔

''تھینکس'' وہ مسکرا کر بولا۔

چائے پی کر ہم دونوں کلاس میں واپس لوٹ آئے۔

ایک کے بعد دوسرا دن۔ دوسرے کے بعد تیسرا اور اسی طرح وقت گزرنے لگا۔ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ میں اور یوسف بھی کافی کچھ قریب آ گئے تھے، لیکن اس کے جملوں کی کڑواہٹ اور اس کے اکھڑ پن والے رویے اب بھی جیوں کے تیوں باقی تھے۔ یہ شاید اس کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ وہ اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں بات کرنے سے کتراتا ہے۔ میں نے پوری کوشش کی تھی کہ اس سے اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں کبھی نہ پوچھوں۔ میں نے کئی بار دیکھا تھا کہ اس سے اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کرنے والوں کو شرمندہ ہونا پڑا تھا۔

کلاس میں میرے سوا اس کے کسی اور سے قریبی تعلقات نہ بن سکے۔ زیادہ تر ہم جماعت اس سے بچ کر نکل جاتے۔ لڑکیاں تو کبھی اس کے قریب بھی نہ پھٹکتیں۔ کبھی کوئی لڑکی اس سے بات کرنا بھی چاہتی تو وہ ایسا لہجہ اختیار کرتا کہ لڑکی کو بھاگنا پڑتا۔ اس کے ان رویوں کے باوجود کلاس میں اس کی خاصی عزت تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ کلاس میں سب سے تیز تھا۔

میں اکثر سوچتا کہ ایسے کون سے نفسیاتی الجھاوے ہیں جنھوں نے یوسف کو ایسا بنا دیا ہے لیکن ان الجھاووں کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش میں نے کبھی نہ کی کہ مجھے اس کی دوستی عزیز تھی میں اسے کھونا کبھی پسند نہ کرتا۔ دھیرے دھیرے مجھے اس سے لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ مجھے اس کی صاف گوئی اور ٹرانسپیرنٹ رویے بے حد اچھے لگتے منافقوں اور ریاکاروں کی بھیڑ میں وہ سب سے الگ دکھائی پڑتا۔

کئی بار مجھ سے میرے ہم جماعت سوال کرتے۔ ''یار تم نے اسے کیسے رام کیا؟''

میں مسکرا کر رہ جاتا۔ میں انھیں کیسے بتاتا کہ ایسے دوست سے قریب آنے کے لئے قوت برداشت ضروری ہے اور اتنی قوت برداشت کس میں تھی کہ وہ یوسف کے اکھڑ رویوں کو جھیل سکتا۔

آہستہ آہستہ یوسف مجھ سے مانوس ہوتا گیا۔ وہ اکثر چھٹیوں میں جب اپنے گھر نہ جاتا تو میری طرف نکل آتا، دن بھر رہتا، اس سے دنیا بھر کی باتیں ہوتیں۔ کبھی پالیٹکس پر، کبھی ادب پر، کبھی اسپورٹس پر، کبھی تیزی سے تبدیل ہوتی ہوئی سماجی قدروں پر۔

میں اکثر سوچتا کہ ایسے کون سے نفسیاتی الجھاوے ہیں جنھوں نے یوسف کو ایسا بنا دیا ہے لیکن ان الجھاووں کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش میں نے کبھی نہ کی کہ مجھے اس کی دوستی عزیز تھی میں اسے کھونا کبھی پسند نہ کرتا۔ دھیرے دھیرے مجھے اس سے لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ مجھے اس کی صاف گوئی اور ٹرانسپیرنٹ رویے بے حد اچھے لگتے منافقوں اور ریاکاروں کی بھیڑ میں وہ سب سے الگ دکھائی پڑتا۔

کئی بار مجھ سے میرے ہم جماعت سوال کرتے۔ ''یار تم نے اسے کیسے رام کیا؟''

ان باتوں کے درمیان اگر کبھی مذہبی رہنماؤں کا ذکر آ جاتا تو وہ بری طرح چڑھ جاتا۔ وہ کہتا کہ یہ لوگ تذکرے کے قابل ہی نہیں ہیں، یہ دوہری زندگی جیتے ہیں۔ اللہ سے سب کو ڈراتے ہیں مگر خود کبھی نہیں ڈرتے، وہی سب حرکتیں کرتے ہیں جسے کرنے کے لئے دوسروں کو روکتے ہیں۔

میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا تو وہ بگڑ جاتا ''جاوید ان کے قول اور فعل کا کوئی اعتبار نہیں۔ یہ اپنے فائدوں کے لئے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ میرا دل ان لوگوں کو کبھی قبول نہیں کر سکتا۔''

اتنا کہہ کر وہ چپ ہو جاتا پھر چند ثانیوں کے بعد کسی اور موضوع پر گفتگو کرنے لگتا۔

میں نے کئی بار محسوس کیا تھا کہ وہ کسی کسی وقت اچانک خاموش ہو جاتا تو دیر تک خاموش رہتا۔ اس کی آنکھوں کی چمک معدوم ہو جاتی اور اداسی کی پرچھائیاں صاف نظر آنے لگتیں۔ ایسے وقتوں میں میں بھی خاموش ہو جاتا کہ شاید اسے چھیڑنا مناسب نہ ہو۔

اس دن چھٹی تھی وہ میرے گھر صبح ہی صبح آ گیا تھا۔ وہ آتا تو میرے گھر والے بھی خوش ہو جاتے۔ میری ماں پوچھتی کہ یوسف کیا کھاؤ گے؟ جواب میں وہ کوئی سادہ سی فرمائش کر دیتا مثلاً اس دن ہی اس نے کھچڑی پکوائی تھی۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ یوسف میرے والدین کے ساتھ بہت نرم اور محبت بھرا لہجہ اختیار کرتا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی۔

کھانا کھانے کے بعد ہم دونوں لان میں آ کر بیٹھ گئے تھے۔ سردی خاصی تھی، ایسے میں دھوپ مزہ دے رہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد چائے آ گئی، چائے سپ کرتے وقت میں نے دیکھا کہ یوسف کی نگاہیں موسم سرما میں کھلنے والے پھولوں کا جائزہ لے رہی ہیں۔ چاروں طرف رنگ برنگے خوبصورت پھول کھلے ہوئے تھے اچانک یوسف بولا ''جاوید اچھا ہوا کہ ان پھولوں کو خدا نے زبان نہیں دی۔''

''کیوں؟'' میں نے اسے متجسس نظروں سے دیکھا۔

''معلوم نہیں یہ پھول کیا بولتے۔ دل بھی تو دکھا سکتے تھے۔''

مجھے ہنسی آ گئی لیکن اس کی آنکھوں میں سوچ کے ستارے جگمگا رہے تھے۔

چائے ختم کر کے میں نے اسے اس کی محویت

سے باہر نکالنے کی کوشش کی۔ میں نے دوسری باتیں چھیڑ دیں انہیں باتوں کے درمیان میں نے اچانک یوسف سے پوچھا۔۔۔۔۔

''کیوں بھئی تم آئی۔اے۔ایس۔ یا پی۔سی۔ایس۔ کے امتحانوں میں کیوں نہیں بیٹھتے؟ مجھے تمہاری کامیابی کا یقین ہے۔''

میں نے دیکھا کہ میری بات سنتے ہی اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔

''آئی۔اے۔ایس۔، پی۔سی۔ایس۔؟'' وہ بہت کڑوے لہجہ میں بولا۔

''ہاں۔کیوں نہیں؟'' میرا لہجہ بڑا نرم تھا۔

''اگر میں نے ان امتحانوں کو پاس کر لیا اور مجھے نوکری مل بھی گئی تو کیا فرق پڑے گا؟''

''فرق؟ کیا تمہیں فرق نہیں محسوس ہوتا؟''

''بس یہی نا کہ میرے پاس گاڑی ہو جائے گی۔ بنگلہ مل جائے گا۔ پیسوں کی ریل پیل ہو جائے گی۔ میرے ارد گرد لوگوں کی بھیڑ رہے گی اور میں تمہیں بڑے ریستوراں میں کھانا کھلا سکوں گا۔'' وہ زور سے ہنسا۔اس کی ہنسی میں کڑواہٹ اور طنز کی بے پناہ شدت تھی۔

''نہیں، بس اتنا ہی نہیں، سوسائٹی میں تمہاری عزت بڑھے گی، تمہیں وقار حاصل ہوگا، لوگوں کے رویے بدلیں گے۔'' میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''وقار، عزت، رویے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔'' وہ دانت پیس کر بڑبڑایا۔

میں چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ وہ تلملا کر پھر بولا ''سنو! تم نے میرے زخم کرید دیے ہیں۔ میں نے آج تک کبھی اپنی ذاتی زندگی کسی سے بھی ڈسکس نہیں کی مگر آج میں تمہیں اپنی زندگی کی تصویریں دکھاؤں گا۔ یہ تصویریں ہر لمحہ میری آنکھوں کے سامنے ناچتی رہتی ہیں اور مجھے کچوکے لگاتی رہتی ہیں۔''

وہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہو کر مجھے غور سے دیکھتا رہا۔ پھر میری آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال کر بولا۔

''میرے والد کا نام غلام رسول ہے مگر گھر کے لوگ انہیں نہ جانے کیوں پھگن کے نام سے پکارتے تھے۔ پھر قصبے کے بڑے لوگوں نے ان کے گلے میں پھگن چکوا کی نیم پلیٹ ٹانگ دی اور ہر کوئی انہیں اسی نام سے بلانے لگا۔ یہ لوگ ہم جیسوں کا نام بگاڑ کر ہی ہماری اوقات بتاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ میرے

''میرے والد کا نام غلام رسول ہے مگر گھر کے لوگ انہیں نہ جانے کیوں پھگن کے نام سے پکارتے تھے۔ پھر قصبے کے بڑے لوگوں نے ان کے گلے میں پھگن چکوا کی نیم پلیٹ ٹانگ دی اور ہر کوئی انہیں اسی نام سے بلانے لگا۔ یہ لوگ ہم جیسوں کا نام بگاڑ کر ہی ہماری اوقات بتاتے ہیں۔

یہ الگ بات ہے کہ میرے والد نے کبھی چکوا گیری نہیں کی۔ ہاں ہمارے دادا چکوا گیری کیا کرتے تھے۔ میرے والد تو کھیتی باڑی پر ہی اپنی گزر بسر کرتے رہے۔''

والد نے کبھی چکوا گیری نہیں کی۔ ہاں ہمارے دادا چکوا گیری کیا کرتے تھے۔ میرے والد تو کھیتی باڑی پر ہی اپنی گزر بسر کرتے رہے۔''

''اوہ'' میرے منہ سے نکلا۔

میں نے یوسف کی طرف دیکھا تو لگا کہ جیسے وہ احساسات کے کسی بڑے طوفان میں گھر گیا ہے اس کا پورا وجود تیز رو دریا میں بہتے ہوئے پتے کی مانند لرز رہا تھا۔

اس نے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کی۔ پھر قدرے توقف سے بولا۔

''میرے بڑے بھائی غفور احمد پی۔سی۔ایس۔ افسر ہیں۔اب وہ قصبے میں نہیں آتے۔''

''کیوں؟ ایسا کیوں؟'' میرے لہجے سے اب بے چینی عیاں ہونے لگی تھی۔

''ان کا خیال تھا کہ آفیسر بننے کے بعد جب وہ قصبے میں آئیں گے تو لوگ ان کی آؤ بھگت کریں گے لیکن ان کا خیال غلط ثابت ہوا۔ گاؤں میں ان کی پہچان اب بھی پھگن چکوا کے لونڈے گفورو ا کی حیثیت سے ہی ہو رہی تھی۔ان باتوں سے غفور بھائی کو شدید ذہنی جھٹکا لگا۔ وہ قصبے سے گئے تو پھر کبھی واپس نہیں آئے۔''

''اوہ مائی گڈنس Goodness'' میں نے یوسف کو حیرت اور تاسف سے دیکھا۔

وہ خاموش ہو گیا۔اس کی آنکھوں میں دکھ کے ساتھ نفرت کی چنگاریاں بھی تیر رہی تھیں۔

یوسف اچانک کھڑا ہو گیا۔

''کہاں؟'' میں نے اسے کھڑے ہوتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

''بس اب چلوں گا''

''ایسے نہیں۔تم شام کا کھانا کھا کر ہی جاؤ گے۔'' میں نرم اور محبت بھرے لہجہ میں بولا۔

مگر وہ رکا نہیں چلا گیا۔

پھر اس سے کئی دنوں تک ملاقات نہیں ہوئی۔ شاید وہ قصبے چلا گیا تھا۔

قصبے سے واپسی کے بعد وہ مجھ سے ملنے میرے گھر آیا تو میں نے محسوس کیا کہ اس کے پورے وجود پر اب بھی اداسی کی ایک دبیز چادر لپٹی ہوئی ہے۔

''تم اچانک قصبے سے کیسے چلے گئے؟ تمہارا ایسا کوئی پروگرام تو تھا نہیں؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''اس دن تمہارے یہاں سے واپسی کے بعد جب میں اپنے کمرے پہنچا تو قصبے کے ہی ایک لڑکے

سے معلوم ہوا کہ وہاں سمپت آیا ہوا ہے۔ بس میں اس سے ملنے چلا گیا۔''

''سمپت۔۔۔۔؟'' میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ہاں سمپت۔۔۔۔ وہ میرے بچپن کا دوست ہے۔ اسے بڑی محنت کے بعد تحصیلداری نصیب ہوئی تھی۔ قصبے میں کبھی کبھی آتا ہے کہ اس کے گلے میں بھی سمپتوا دھوبی کی نیم پلیٹ لٹکی ہوئی ہے۔ آہ! قصبے کی گلیوں کی یہ فقرے بازیاں۔ وہ بے حد حساس ہے۔ گاؤں آکر ہمیشہ پچھتاتا ہے، طے کرتا ہے کہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا لیکن پھر آجاتا ہے۔ اس کے اندر غفور بھائی جیسی مضبوط قوت ارادی کہاں کہ ہزاروں برس سے دبے اور کچلے ہوئے یہ لوگ۔''

وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہوگیا۔

''میں تمہاری بات سمجھ گیا یوسف۔ میں تم سے متفق ہوں، مگر کیا کیا جا سکتا ہے۔'' میں اسے غور سے دیکھتا ہوا بولا۔

میری بات سن کر بھی وہ خاموش رہا۔ بس مجھے خالی خالی نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ چلا گیا۔

وقت سرعت کے ساتھ گزر رہا تھا۔ دو سال یوں بیت گئے کہ پتہ ہی نہ چلا۔

یوسف ایم۔اے۔کر کے اپنے قصبہ واپس چلا گیا۔ وہ کچھ یوں گیا کہ پھر اس کے بعد اس سے کبھی ملاقات نہ ہوئی۔

اور اب تیس برس بعد مجھے اس کے قصبے آنے کا اتفاق ہوا تو اس سے ملنے کی شدید خواہش جاگ پڑی۔

قصبے کے کچھ لوگ اسے ڈھونڈنے نکلے ہوئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ ایک مولانا صاحب چلے آ رہے ہیں۔ لمبی سی داڑھی، کرتا پائجامہ پہنے ہوئے۔ ان کے پیچھے ان کے چیلا چپاٹی۔ ساتھ میں وہ لوگ بھی جو یوسف کو ڈھونڈنے نکلے تھے۔

میں نے سوچا کہ یہ لوگ کسے پکڑ لائے۔ وہ تو یوسف کی تلاش میں نکلے تھے۔

مولانا کو دیکھتے ہی میرے میزبان کھڑے ہو گئے اور بڑی عزت کے ساتھ انھوں نے ان کو بٹھایا۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ بہر حال میں نے بھی کھڑے ہو کر ان کی تعظیم کی۔

''یہ مولانا یوسف ہیں۔'' میرا میزبان میری

''پھگن چکوا کا لونڈا یوسفوا دس سال پہلے جل جل کر مر گیا تھا اور اس کی راکھ سے میں پیدا ہوا ہوں میں مولانا یوسف۔ گاؤں والے میرے ایک اشارے پر کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ گاؤں کے تمام گھروں سے عورتیں میرے پاس دعا کرانے کے لئے آتی ہیں اور میں مولانا یوسف ان کے سروں پر ہاتھ پھیر کر ان کے لئے دعائیں کرتا ہوں۔'' وہ مسکرایا۔ اس کی طنزیہ مسکراہٹ زہر میں بجھی ہوئی تھی۔ میں تلملا گیا لیکن میں اب بھی یقین اور بے یقینی کے درمیان جھول رہا تھا۔ اچانک مجھے کچھ یاد آیا اور میں نے یوسف سے پوچھا

طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''مولانا یوسف۔۔۔؟'' میں اسے خالی خالی نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

''جی ہاں میرا نام یوسف ہے۔'' مولانا میری طرف دیکھ کر بولے۔

اب میں یوسف کو اس کی آواز سے پہچان گیا تھا۔

میں فوراً اس کو گلے لگانے کے لئے اٹھا تو وہ بھی میری طرف لپکا۔ وہ بھی مجھے پہچان گیا تھا۔ ہم دونوں بہت ٹوٹ کر گلے ملے اور دیر تک باتیں کرتے رہے نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں۔ تیس برس کے درمیان جانے کتنا مسالہ اکٹھا ہو گیا تھا۔

دفعتاً وہ جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اسے رخصت کرنے کے لئے باہر تک آیا تو وہ مجھے الگ لے جا کر آہستہ سے بولا :

''پھگن چکوا کا لونڈا یوسفوا دس سال پہلے جل جل کر مر گیا تھا اور اس کی راکھ سے میں پیدا ہوا ہوں میں مولانا یوسف۔ گاؤں والے میرے ایک اشارے پر کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ گاؤں کے تمام گھروں سے عورتیں میرے پاس دعا کرانے کے لئے آتی ہیں اور میں مولانا یوسف ان کے سروں پر ہاتھ پھیر کر ان کے لئے دعائیں کرتا ہوں۔'' وہ مسکرایا۔

اس کی طنزیہ مسکراہٹ زہر میں بجھی ہوئی تھی۔ میں تلملا گیا لیکن میں اب بھی یقین اور بے یقینی کے درمیان جھول رہا تھا۔ اچانک مجھے کچھ یاد آیا اور میں نے یوسف سے پوچھا:

''یار وہ تمہارا دوست سمپت۔۔۔۔۔؟''

''اچھا وہ! اس نے تو خودکشی کر لی۔'' یوسف کی آواز میں بے چینی تھی۔

''کیوں؟'' میرے اس کیوں پر یوسف ہنسا۔ اس کی ہنسی میں درد کی ٹیسیں موجود تھیں۔ وہ دھیرے سے بولا :

''سمپت کو ہمیشہ سمپتوا دھوبی ہی رہنا تھا، اسے کسی مندر کا پروہت بننے کے لئے ہزاروں سال انتظار کرنا پڑتا اور وہ اتنا انتظار کیسے کرتا۔''

یوسف چلا گیا۔

اس کے پیچھے اٹھنے والا غبار میری آنکھوں، حواس اور محسوسات پر جیسے چھا گیا اور میری آنکھیں دور تک خلا میں گھورتی رہیں۔

❑❑❑

نیم سرائے

عادل فراز

ہلوانہ سادات، گنگوہ، سہارنپور

موبائل: 8896531406

ملحقہ کمرے سے مسلسل پلنگ کی ''چرچراہٹ'' کی آوازیں آرہی تھیں۔ جیسے پلنگ پر دو لوگ آپس میں گتھم گتھا ہوں۔ پلنگ کی چولیں شاید حد سے زیادہ ڈھیلی تھیں اس لئے چرچراہٹ کی آوازیں بھی مسلسل بڑھتی جارہی تھیں۔ رحمان جھنجھلاہٹ کے عالم میں بستر سے اٹھا اور کمرے کی لائٹ جلادی۔ جیسے ہی کمرہ روشن ہوا آوازوں کا سلسلہ بھی منقطع ہوگیا۔ اسکے کمرہ کی روشنی روشندان سے چھن کر دوسرے کمرے میں جارہی تھی، تبھی وہاں موجود افراد کو احساس ہوا کہ کوئی جاگتا ہوا بالغ شخص انکی شہوت زدہ آوازوں کو سن رہا ہے اور لائٹ جلا کر انہیں متوجہ کرتا ہے کہ سکون کے ساتھ زور آزمائی کریں۔ گھر میں مہمانوں کی کثرت اور شادی بیاہ کے ہنگامے پہلے ہی اسکی نیند خراب کر چکے تھے۔ اب جبکہ نصف شب گذر چکی تھی اور چاروں طرف سناٹا پسرا ہوا تھا اس نے سونے کی ہر ممکن کوشش کی مگر نیند اسکی آنکھوں کے علاقے سے کوسوں دور تھی۔ اسکا تھکا ماندہ ذہن تازگی چاہتا تھا جو میسر نہیں تھی۔ اسکی بیوی مہمانوں کی دیکھ ریکھ میں مصروف تھی۔ بیڈروم میں اب اسکی آمد کا امکان نہیں تھا۔ یوں بھی اسکے لئے بیوی کا وجود عدم کی مثال تھا کہ وہ ہر خواہش اور ہر لذت کی طلب سے آزاد تھی۔ مگر پھر بھی جانے کیوں اسے بیوی کی کمی شدت سے محسوس ہورہی تھی۔ اسکی تنہائی مزید ذہنی وجسمانی تھکن کا احساس بڑھا رہی تھی۔ اس نے اکتاہٹ کے عالم میں کسیلی جماہی لی اور سوچا کہ ان تنہائیوں اور کسل مندیوں کو کتاب کے مطالعہ سے دور کیا جائے اور ہمیشہ کی طرح اپنے احساس محرومی کے خاتمہ کے لئے زیر مطالعہ واقعہ کو ڈائری میں تحریر کرے۔

اس خیال کے ساتھ ہی وہ بستر سے اٹھا اور الماری کی طرف بڑھ گیا۔ الماری کے پٹ اس طرح کھولے گئے کہ اسکی آوازیں برابر کے کمرے میں موجود شخص کے لئے اذیت کا سبب نہ ہو۔ عالم تساہلی میں اس نے ڈائری کے صفحات الٹنا پلٹنا شروع کئے جہاں کئی جنسی ہیجان انگیز واقعات اس نے تحریر کئے تھے۔

> گیتا، بائبل، انجیل، گرو گرنتھ غرض کہ ہر دھرم کی مذہبی کتابیں اسکے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ ہر مذہبی اور تاریخی کتاب میں اسے جنسیت نظر آئی اور محسوس ہوا کہ ہر کتاب اس تناظر میں عورت کا یکساں تصور پیش کرتی ہے یعنی اسکی خلقت کا مقصد محض مردوں کے جذبۂ شہوت کی تسکین، افزائش نسل اور امور خانہ داری تک سمٹ گیا ہے۔
>
> اس نے ہر کتاب میں میں عورت کو فطری جبر کا شکار محسوس کیا۔ وہ بھی عورت کے وجود کو قدیم فلسفیوں کے نقطۂ نگاہ سے ہٹ کر دیکھنے کا عادی نہیں تھا۔

رحمان کو زمانہ قدیم کی تاریخ میں گہری دلچسپی تھی۔ ایسے تاریخی واقعات جو اسکی جنسی محرومی کا سد باب کریں اور برانگیختہ جذبات کی تسکین کا سبب بن سکیں۔ ہر تاریخی اور مذہبی کتاب کو وہ ایک ہی زاویۂ نگاہ سے دیکھتا تھا۔ ہر کتاب میں اسے کہیں نا کہیں اپنے ذوق کی تسکین کا سامان مل جاتا تھا۔ ایسے ہر تاریخی واقعہ کو وہ اپنی ڈائری میں لکھ لیتا مزید یہ کہ اس واقعہ پر اپنا تبصرہ بھی واقعہ کے آخر میں محفوظ کرلیتا تھا۔ اس فعل کو اسکی عادت سمجھ لیں یا ذہنی مرض مگر یہ حقیقت ہے کہ اسکی ڈائری میں ایسے مختلف تاریخی اور مذہبی واقعات کی کثرت تھی جن میں جنسی شعور کارفرما تھا۔ اس نے کبھی اپنی ڈائری میں لکھے واقعات اور واقعات پر محفوظ تبصروں کو عوامی نہیں کیا۔ اسے علم تھا کہ گذشتہ امتیں آج کی امتوں سے زیادہ شہوت پرست اور بد تہذیب تھیں۔ گیتا، بائبل، انجیل، گرو گرنتھ غرض کہ ہر دھرم کی مذہبی کتابیں اسکے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ ہر مذہبی اور تاریخی کتاب میں اسے جنسیت نظر آئی اور محسوس ہوا کہ ہر کتاب اس تناظر میں عورت کا یکساں تصور پیش کرتی ہے یعنی اسکی خلقت کا مقصد محض مردوں کے جذبۂ شہوت کی تسکین، افزائش نسل اور امور خانہ داری تک سمٹ گیا ہے۔ اس نے ہر کتاب میں میں عورت کو فطری جبر کا شکار محسوس کیا۔ وہ بھی عورت کے وجود کو قدیم فلسفیوں کے نقطۂ نگاہ سے ہٹ کر دیکھنے کا عادی نہیں تھا۔

آج پھر اسکے ہاتھوں میں ایک مذہبی کتاب تھی۔ اس نے تساہلیت کے عالم میں کتاب کے صفحات پلٹنا شروع کئے اور مختلف امتوں کی سرکشیاں، نزول

عذاب کے اسباب وعوامل جیسے واقعات پر اسکی نگاہیں گردش کرتی رہیں ۔تبھی اسکی نگاہیں ایک واقعہ کے ابتدائی الفاظ پر ٹھہر گئیں، واقعہ کے ابتدائی الفاظ جو کتاب کے حاشیہ پر نقل تھے'' وہ امت بدترین خلائق میں شمار ہوتی تھی کہ اس کے بڑے چھوٹے عورتیں اور مرد اخلاقی پستی کا شکار تھے ۔انہیں سدھارنے کی ہر سعی، سعی رائیگاں تھی کہ وہ سدھرنے والی امت نہیں تھی''اس کے تجسس میں اضافہ ہوا۔آخر وہ کونسی امت ہے جسے اس کتاب میں بدترین خلائق میں شمار کیا گیا ہے۔اس نے غائرانہ پورے واقعہ کا مطالعہ کیا مگر اسکا تجسس کم نہیں ہوا۔اس نے ایک بار پھر واقعہ کو نئے سرے سے پڑھنا شروع کیا اور ساتھ ہی ہم جز کو اپنی ڈائری میں لکھتا گیا۔

''سدوم شہر کے باشندے اپنے اگلوں اور پچھلوں میں بدترین امت تھے کہ انہوں نے خلاف فطرت عمل کیا اور اپنی کھیتیوں کی طرف توجہ نہیں کی'' اس نے سوچا کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک امت اگر اپنی کھیتیوں کی حفاظت نہ کرے تو اسے بدترین خلائق قرار دیدیا جائے۔اس نے واقعہ کا مطالعہ جاری رکھا اور ڈائری میں لکھتا گیا۔

''سدوم شہر جو شام ومصر کے درمیان عام شاہراہ پر واقع تھا۔اس شہر کے باشندے اپنے وقت کے بخیل ترین اور حددرجہ کاہل تھے۔زمینیں زرخیز تھیں مگر زرخیز زمینیں خود فصلیں نہیں اگاتیں، سوائے ہر بھری گھاس اور جڑی بوٹیوں کے۔یہ لوگ چند بھیڑوں اور بکریوں کے اثاثہ پر مباہات کرتے۔انہی کا دودھ دُہتے اور کھجوروں کے ساتھ نوش کرتے۔انکی مرغوب غذا ثرید تھی جو روٹی اور گوشت کے آمیزہ سے تیار ہوتی مگر اس لذیذ غذا کے لئے وہ اپنی بھیڑ بکریوں کو قربان نہیں کرسکتے تھے کہ یہ آسان ذریعۂ رزق بھی ختم ہوجائے۔ انہیں من وسلویٰ کے نزول پر یقین نہیں تھا کہ وہ اللہ کی عبادت اور سامنے گڑگڑا کر دعا کرنے کو اپنی ہتک عزت سمجھتے تھے۔دن بھر کی بیکاری اور مٹرگشتی انکا شیوہ تھا۔یا پھر وہ اپنی عورتوں کے ساتھ پہاڑوں کے تاریک دروں میں دن بھر کلھیا میں گڑ پھوڑتے رہتے۔عورتوں کی مسلسل صحبتوں نے انہیں نحیف اور بوڑھا بنادیا تھا۔

ان کی عورتیں جانوروں کی طرح بچے جنتی رہیں کہ انہیں اس کام میں بڑی لذت ملتی تھی۔تنگ دستی اور مفلوک الحالی بھی انہیں محنت ومشقت پر نہیں ابھارتی تھی۔انہیں جانوروں کے بلوں جیسے گھروں میں رہنا پسند تھا،کھارے پانی کو کھجوروں کی آمیزش سے میٹھا بنالیتے

> ''سدوم شہر جو شام ومصر کے درمیان عام شاہراہ پر واقع تھا۔اس شہر کے باشندے اپنے وقت کے بخیل ترین اور حددرجہ کاہل تھے۔زمینیں زرخیز تھیں مگر زرخیز زمینیں خود فصلیں نہیں اگاتیں، سوائے ہر بھری گھاس اور جڑی بوٹیوں کے۔یہ لوگ چند بھیڑوں اور بکریوں کے اثاثہ پر مباہات کرتے۔انہی کا دودھ دُہتے اور کھجوروں کے ساتھ نوش کرتے۔انکی مرغوب غذا ثرید تھی جو روٹی اور گوشت کے آمیزہ سے تیار ہوتی مگر اس لذیذ غذا کے لئے وہ اپنی بھیڑ بکریوں کو قربان نہیں کرسکتے تھے کہ یہ آسان ذریعۂ رزق بھی ختم ہوجائے۔

،غذا کی قلت تھی پھر بھی افزائش نسل میں کمی نہیں تھی''۔ آخری جملہ کی قرأت پر وہ زیرلب مسکرایا۔کچھ دیر فکرمند رہا اور پھر بین السطور اپنا تبصرہ لکھا۔'' آج بھی غذا کی قلت اور وسایل کی کمی کے باوجود بلاتفریق مذہب وملت ہم دنیا کی آبادی کی افزائش میں مصروف نہیں ہیں،تو پھر وہی امت بدترین خلائق کیوں شمار کی جاتی ہے؟''

بہر حال اب رحمان کو واقعہ کی قرأت میں لذت کا احساس ہونے لگا تھا۔وہ دوبارہ اصل واقعہ کی طرف پلٹا۔

''عالم غربت میں بھی انکے یہاں مسافروں اور مہمانوں کی آمدورفت کی کثرت تھی۔اپنے آباءواجداد کو وہ اکثر کوستے کہ کس منحوس گھڑی میں انہوں نے یہاں بسنے کا ارادہ کیا اور اس عذاب میں عمداً مبتلا ہوئے اور نسلوں کے لئے افلاس کی وراثت چھوڑ گئے۔عام شاہراہ کے قریب واقع آبادیوں کے لئے قافلوں کی آمد اور مہمان نوازی وبال جان بن جاتی ہے اور اگر یہ آبادیاں حددرجہ بخیل،کاہل اور افلاس زدہ ہوں تو مہمانوں کی آمد عذاب لگتی ہے۔وہ مسافروں اور قافلوں کی آمدآمد پر جی چھوڑ چکے تھے۔ جونہی اونٹوں کی گردنوں میں بندھی گھنٹیوں کی آواز سنائی پڑتی وہ اپنے گھروں میں یوں دبک جاتے کہ جیسے شکاری کے خوف سے شکار بلوں میں دبک جاتے ہیں۔مگر تھکے ماندے اور جان لیوا صحرا کے آزمائے ہوئے مسافروں کو تازہ دمی کے لئے یہ شہر جنت نظیر تھا۔بادل نخواستہ شہر کے باشندوں کو انکی ضیافت کا اہتمام کرنا پڑتا کہ ان قافلوں میں شام ومصر کے رؤساء اور دولت مند تاجر ہوتے تھے۔

شہر کے بزرگ اور شوریٰ کے سربرآوردہ لوگوں نے اس مصیبت سے نجات پانے کے لئے کئی منصوبوں پر تبادلہ خیال کیا مگر ہر منصوبہ زیرغور ہی رہا۔انکا شعور تدبر وتعقل شہوت زدہ ہوچکا تھا۔پھر یوں ہوا کہ ایک دن ان کے مشورت کدے میں ایک اجنبی خوبرو لڑکا دکھائی دیا جسکے رخساروں پر ابھی سبزہ اگا چاہتا تھا۔اس نے ہر کسی کی رائے سنی مگر وہ کسی کے صوابدید پر مطمئن نہ ہوا۔وہ شوریٰ میں ہر کسی کی رائے سے اختلاف نظر کرتا رہا۔شہر کے صائب الرائے افراد کے مشوروں کو احمقانہ کہا اور خوب ٹھٹھا کیا۔اس کے اس ردعمل پر سب برانگیختہ ہوا ٹھے اور کہنے لگے'' اے شخص کون ہے تو جو ہر رائے اور ہر نظر سے اختلاف کرتا ہے، ہمارا محول بناتا ہے جبکہ ہم اس بستی کے صائب الرائے افراد ہیں نہیں معلوم تجھے کہ اس جرم میں تیری زندگی کا خاتمہ بھی ہوسکتا ہے''۔اس نے انتہائی متانت سے مسکراتے

ہوئے جواب دیا:

''اے بستی کے مشائخ اور باعزت لوگو، میں بھی ایک مسافر ہوں لیکن تمہاری بوالعجبی اور طفلانہ مشقی پر کڑھ رہا ہوں، اگر میری گردن زدنی تمہاری پریشانیوں کے حل کا سبب بن سکتی ہے تو تامل کیوں کرتے ہو میری شہ رگ حیات کو منقطع کردو مگر عرش کی بلندی پر چمکتے ہوئے سورج کی تیز شعاؤں کی قسم یہ تمہارے مسائل کا حل نہیں ہے البتہ میں جانتا ہوں کہ تم کیسے ان مسائل سے نجات پاسکتے ہو''۔اس کی صواب دید پر سب خاموش رہے۔جیسے وہ سب اسکے دلائل کے سامنے اظہار عجز کررہے ہوں۔ وہ شکست خوردہ سپاہیوں کی طرح سرخمیدہ تھے اور کہنے لگے''اے نجات دہندہ مسافر تو تامل کیوں کرتا ہے اور ہمیں کشمکش میں مت ڈال کہ بتا ہم کیسے اس عذاب سے نجات پاسکتے ہیں'' شہر کا شہر اسکی جانب پرامید نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور وہ شوریٰ کے بزرگوں کے سامنے بے نیازانہ کھڑا تھا ۔اس نے کچھ دیر تفکر کیا اور پھر گویا ہوا''اے قوم کے بزرگو یہ رائے صائب ہے مگر میں جانتا ہوں کہ اس رائے سے اختلاف کیا جائیگا اور مجھے پختہ یقین ہے کہ کچھ دور اندیش افراد میری عقل کی سلامتی پر بھی شک کریں'' مجمع حیرت زدہ اسکے خوبصورت چہرے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔اسکا سلیقہ گفتگو اور زبان و بیان پر اسکی گرفت ان بدوؤں کو مرعوب کرچکی تھی۔ انکے بزرگ مؤدبانہ عرض کرنے لگے''اے جوان ہم نے تمہاری رائے ابھی سنی ہی نہیں کہ اختلاف کریں، تم بے خوف کہو کہ تمہاری عقل کیا فیصلہ کرتی ہے اور کیا راہ نجات ہمیں دکھاتی ہے؟''

''تو سنو اے مسافروں اور ناخواستہ مہمانوں سے رنج اٹھائے ہوئے لوگوں، اس مصیبت سے نجات کا واحد حل یہ ہے کہ جو بھی مسافر تمہارے یہاں مہمان بن کر اترے تم اسکے ساتھ حسن سلوک کرو اور اپنے گھروں میں ٹھہراؤ، اچھی غذا فراہم کرو اور اپنا بستر انہیں سونے کے لئے دو اور پھر رات کے آخری حصے میں انکے ساتھ وہی سلوک کرو جو ہر رات تاریک پہاڑی دروں میں تم اپنی بیویوں کے ساتھ کرتے ہو ،انہیں اپنی کھیتیاں سمجھو کہ خوب جوتو اور ہل چلاؤ کہ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے''۔رحمان کا ذہن اب کھیتیوں کی علامت کو سمجھنے سے قاصر نہیں تھا۔اب واقعہ کی قرأت میں اسے مزید لذت مل رہی تھی کہ ہم نے تو آج تک ہر مذہبی کتاب کو صرف تلذذ کے لئے پڑھا یا شدت پسندی کو بڑھاوا دینے کے لئے یہی تو قوموں کا المیہ رہا ہے۔رحمان نے اپنے ذہن میں

''اے میری قوم کے رنج اٹھائے ہوئے لوگو! کس فکر میں مبتلا ہو، یہ صائب الرائے بھی تو ایک مسافر ہے اور خوبصورت ہونے کے ساتھ جوان بھی ہے۔ابھی اسکے رخساروں پر سبزہ بھی نہیں اگا ہے کہ گویا وہ ایسا ہی ہے جیسے تمہاری پہلی رات کی بیویاں ہوں تو پھر تم کس فکر میں مبتلا ہو کہ اسکے ساتھ ویسا ہی سلوک کرو جیسا اس نے تمہیں کرنے کا مشورہ دیا ہے اور برحق ہے یہ جوان اپنی رائے پر کہ یہ رائے دہندہ اسی لت کا شکار ہے تو پہلے تم اسی کو کیوں نہیں آزماتے کہ تمہاری جھجک ختم ہوجائے''۔

اٹھتے سوالات کی طرف توجہ نہیں کی اور وقعہ کو تحریر کرنے لگا۔اسکا تجسس ابھی برقرار تھا کہ آیا وہ اس جوان سے اختلاف نظر کریں گے کہ یہ عمل واقعی قانون فطرت کے خلاف ہے لیکن کیا یہ لوگ فطرت کے عالم تھے؟

اس نے آگے لکھنا شروع کیا۔

''جوان اپنی رائے دے چکا تو سب ہکا بکا اسکی طرف دیکھنے لگے کہ اسکی اس احمقانہ مگر نجات دہندہ رائے پر کیا ردعمل پیش کریں۔جوان انکی خاموشی پر حیران ہوا کہ وہ تو انہیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے جارہا تھا مگر وہ اب بھی مفلسی اور ناداری کی تاریکیوں میں رہنے کو ترجیح دے رہے تھے۔وہ خاموشی کے ساتھ مجلس شوریٰ سے نکلا اور اپنی منزل کی طرف بڑھ گیا۔تبھی ایک بزرگ کی آواز مجمع عام میں ابھری۔

''اے میری قوم کے رنج اٹھائے ہوئے لوگوں کس فکر میں مبتلا ہو، یہ صائب الرائے بھی تو ایک مسافر ہے اور خوبصورت ہونے کے ساتھ جوان بھی ہے۔ابھی اسکے رخساروں پر سبزہ بھی نہیں اگا ہے کہ گویا وہ ایسا ہی ہے جیسے تمہاری پہلی رات کی بیویاں ہوں تو پھر تم کس فکر میں مبتلا ہو کہ اسکے ساتھ ویسا ہی سلوک کرو جیسا اس نے تمہیں کرنے کا مشورہ دیا ہے ،اور برحق ہے یہ جوان اپنی رائے پر کہ یہ رائے دہندہ اسی لت کا شکار ہے تو پہلے تم اسی کو کیوں نہیں آزماتے کہ تمہاری جھجک ختم ہوجائے''۔بزرگ کے جملے ابھی ختم نہیں ہوئے تھے کہ بستی کے جوان اس مسافر کو دبوچ لائے اور ایک تاریک درے سے اپنی عورتوں کو باہر نکال لائے اور اسکے ساتھ وہی کیا جو کہ اس نے کرنے کا مشورہ دیا تھا مگر وہ جوان مسافر انکی اس حرکت پر رنجیدہ خاطر نہیں تھا، نا اس نے اپنا دفاع کیا اور نہ شور مچایا۔اس نے سدوم شہر کے لوگوں کی مدد کی کھیتی جوتنے میں اور خوب ہل چلانے میں کہ وہ تو اسی کی لت ڈلوانے کے لئے مبعوث ہوا تھا۔شہر کے سبھی بزرگوں اور جوانوں نے اس کے ساتھ مل کر خوب کھیت جوتے اور ہل چلائے کہ وہ اپنی ذاتی کھیتیوں کو بنجر سمجھ بیٹھے۔انکی اپنی کھیتیاں مرجھانے لگیں کہ انہیں کوئی جوتنے والا اور پانی دینے والا نہیں تھا۔شہر کا شہر اس لت کا شکار ہو چکا تھا اور اب انہیں اس جوان کی جدائی عذاب معلوم ہوتی تھی۔

جوان اپنی بعثت کے مقصد اصلی کو پہنچ گیا تو کچھ یوں شہر سے غائب ہوا کہ آج تک سدوم شہر کے لوگ

گدھے کے سر پر سینگ کی طرح اسے تلاش کرتے رہے مگر نہ گدھے کے سر پر سینگ اُگے اور نہ وہ جوان نوخیز پلٹ کر اس شہر میں واپس آیا۔ وہ اس شہر کے باشندوں کو جنسی ونفسیاتی مریض بنا گیا تھا کہ یہی وہ چاہتا تھا۔جس طرح سگریٹ کی لت کا شکار آدمی ہر لحہ اپنی جیبوں میں سگریٹ کا پیکٹ تلاش کرتا ہے اسی طرح وہ لوگ عام شاہراہوں پر قافلوں کے منتظر رہنے لگے۔انکی ایسی شہرت ہوئی کہ تاجروں اور مسافروں نے اس راہ سے گذرنا ہی ترک کر دیا۔اگر کبھی کوئی بے خبر اس راہ پر آنکلا تو وہ اس اجنبی مسافر کو اٹھالاتے اور اس وقت تک اپنی قید شہوت میں رکھتے کہ جب تک اسکی صحبتوں سے انکی جی اچاٹ نہ ہوجائے ۔برس ہابرس گذرے کہ اس راہ سے کسی قافلے نے گذرنے کی ہمت نہیں دکھائی اور نہ کسی مسافر نے اس شہر کا رخ کیا کہ اب انکی عادتوں اور جرأتوں کی شہرت ایک عالم میں ہوچکی تھی۔

عرصۂ دراز کے بعد وہ اپنی عورتوں کی طرف مائل ہوئے تو متحیر رہ گئے کہ اب وہ انکے لمس کی عادی نہیں رہی تھیں اور انکی ہر خواہش نسوانیت گزیدہ تھی۔ انہوں نے ہر فطری خواہش کی چتا جلا ڈالی اور خوب دھواں اٹھا مگر انکے مردوں کو اس کی بھنک تک نہ لگی ۔اپنی کھیتیوں کی پژمردگی پر انہیں وقتی کوفت ہوئی کہ انکی طرف سے ناامید ہوچکے تھے اور پھر وہ ایک دوسرے کی کھیتیوں کو جوتنے میں لگ گئے اور خوب جوتا کہ انکے ہل ٹیڑھے ہوگئے اور دھار کند پڑ گئی۔ انکی اس اخلاقی تنزلی اور بدترین اطوار پر تنبیہ وتنذیر کے لئے پیغمبر بھیجا گیا کہ وہ انکی فہمائش کر سکے کہ خلاف فطرت جو تم ایک دوسرے کے بلوں میں گھس جاتے ہو یہ عذاب الٰہی کے نزول کا عندیہ ہے ۔ابھی تمہیں فرصت ملی ہوئی ہے کہ اپنی عادت و اطوار کو سدھارلو کہیں ایسا نہ ہو کہ عذاب الٰہی تمہیں جالے اور فرشتے تمہارے بداخلاق شہر کو اپنے پروں پر اٹھا کر اتنا بلند کریں کہ تمہارے جانوروں کی گھنٹیوں کی آوازیں اور عزیزوں کی چیخیں باشندگان عرش سنیں اور پھر تمہیں اسی بلندی سے واپس زمین پر پھینک دیا جائے اور بن جائے تمہارا سرمہ کہ اگلی امتوں کے حالات سے تم عبرت نہیں لیتے۔

بستی کے شیوخ، جوانوں ،لونڈوں اور عورتوں نے اس پیغمبر کا مخول بنایا اور خوب ہنسے کہ انہیں اس کام میں بڑا مزہ آنے لگا تھا۔بستی کی بڑھتی آبادی بھی اب گھٹ کر آدھی رہ گئی تھی کہ کئی سال گذر گئے تھے کہ مردوں نے اپنی زمینوں کا رخ نہیں کیا تھا، نہ جوتا، نہ

جوان اپنی بعثت کے مقصد اصلی کو پہنچ گیا تو کچھ یوں شہر سے غائب ہوا کہ آج تک سدوم شہر کے لوگ گدھے کے سر پر سینگ کی طرح اسے تلاش کرتے ہیں مگر نہ گدھے کے سر پر سینگ نظر آئی اور نہ وہ جوان نوخیز پلٹ کر اس شہر میں واپس آیا۔ وہ اس شہر کے باشندوں کو جنسی ونفسیاتی مریض بنا گیا تھا کہ یہی وہ چاہتا تھا۔جس طرح سگریٹ کی لت کا شکار آدمی ہر لحہ اپنی جیبوں میں سگریٹ کا پیکٹ تلاش کرتا ہے اسی طرح وہ لوگ عام شاہراہوں پر قافلوں کی ٹوہ میں رہنے لگے۔

ہل چلایا نہ پانی دیا تو زمینوں میں فصل کہاں سے اگتی اور بہت سی زمینیں اب بنجر ہوچکی تھیں کہ یہی انکا مقدر تھا'' رحمان قرأت کے دوران چونکا اور متحیر ہوا کہ آخر پیغمبروں کے آنے میں ہمیشہ اتنی تاخیر کیوں ہوجاتی ہے۔ اس نے مزید تفکر کی زحمت نہیں کی کیونکہ اسے مصلحت الٰہی کا علم نہیں تھا۔وہ پھر واقعہ کی طرف متوجہ ہوا اور لکھتا گیا۔

''پیغمبر نے معبد کے شیوخ کو بلایا اور انکی خاموشی پر انہیں خوب پھٹکار لگائی تو وہ بولے کہ ہم کیا کرتے اس اخلاقی بیماریوں کا علاج ہمارے بس سے باہر تھا اور ہم نے جب بھی انکی تو بیخ کی کوشش کی تو بستی کے جارح جوان لے گئے معبد کے جوانوں اور شیوخ کو اٹھا کر اور انہیں جی بھر کر حقہ کی طرح گڑگڑایا اور گندا کر کے واپس معبد میں پھینک گئے۔ اب معبد کی ذمہ داریوں سے ہم سبک دوش ہیں اور خود کو اس لائق نہیں پاتے کہ اس بدترین خلائق پر اللہ کی کتاب کی تلاوت کریں اور جز رو تو بیخ پر خود کو مایل کریں۔ہمیں ڈر ہے کہ کہیں یہ لوگ پھر ہمارے جوانوں اور بوڑھوں کو اٹھا نہ لے جائیں، حقہ کی طرح خوب گڑگڑائیں اور گندا کر کے واپس یہیں پھینک دیں۔پیغمبر نے انہیں سرزنش کی اور کہا'' بندگان خدا یہ تمہاری غفلتوں اور کوتاہیوں کا نتیجہ ہے کہ تم نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حق ادا نہیں کیا اور اس عدم توجہی کے شکار ہوگئے ۔اب جبکہ تمہیں انکی اصلاح پر مائل ہونا چاہئے تو تم پہلو تہی کر رہے ہو ۔جان لو کہ خاموشی بھی ظالم کی حمایت ہے اور عذاب الٰہی کی مستحق ہے''۔پیغمبر ان سے مایوس ہوئے تو شہر کی طرف کوچ کر گئے کہ وہاں انذار کے فرائض انجام دیں۔

پیغمبر نے سدوم کے باشندوں کی اس طرح فہمائش کی کہ حق فہمائش پوارا ہوا تو خداوند نے اس پیغمبر کو پیغام بھیجا کہ اب اس بستی کو فرشتے اپنے رہنے والوں سمیت پلٹ دیں گے اور تم کو حکم ہے کہ بستی سے کوچ کر جاؤ کہیں عذاب کے گھیرے میں نہ آجاؤ۔ خداوند نے دو فرشتوں کو جوان لونڈوں کی شکل میں انکے درمیان بھیجا کہ رات کے کسی پہر پوری بستی کو اپنے رہنے والوں سمیت پروں پر آسمان تک اٹھا کر واپس دے ماریں کہ انکا نام ونشان صفحۂ ہستی سے مٹ جائے ۔وہ لونڈے رکے پیغمبر کے گھر میں تو بستی کے کھلنڈرے اوباش نوجوانوں نے انہیں دیکھ لیا اور انکی نیت خراب ہوگئی ۔انہوں نے اپنے بزرگوں کو انکے

حسن کے قصیدے یوں سنائے کہ ان پر شہوت کا انتہائی غلبہ ہوا اور وہ ان لونڈوں کو حاصل کرنے کے لئے پیغمبر کے گھر میں جبراً داخل ہو گئے کہ انہیں پائیں تو خوب جوتیں اور انکی کھیتیوں میں جی بھر کر ہل چلائیں اور پانی دیں۔وہ خوبرو نوجوان اپنی اصل حقیقت یعنی (فرشتوں کی صورت میں ظاہر ہو چکے تھے)،انہوں نے پیغمبر کو بستی سے نکالا اور پھر اس بستی کو عالم غیظ و غضب میں اپنے پروں پر اسکے باشندوں سمیت اس قدر بلند کیا کہ انکے جانوروں کی گھنٹیوں اور چیخ و پکار کو سنا باشندگان عرش نے اور پھر واپس سب کو زمین پر دے مارا کہ انکی ہڈیوں کا سرمہ بن گیا۔

رحمان نے ڈائری کے صفحہ پر معذب بستی کے انجام کو تحریر کیا اور دیر تک افسردہ رہا کہ یہ مقام افسوس تھا۔ ملحقہ کمرے سے آتی ہوئی پلنگ کی ''چرچراہٹ'' کی آوازیں تیز ہوگئی تھیں۔اس نے جھنجھلا کر ڈائری کو تکیہ پر پھینکا،الماری کے قریب رکھا اسٹول کھینچ کر دیوار کے قریب کیا اور اسٹول پر چڑھ کر اندر جھانکنے کی کوشش کی۔رحمان کے کمرے کی دودھیا روشنی روشندان سے چھن کر اندر جارہی تھی۔ پلنگ پر لحاف ہمہ گیر تھا،لحاف کے نیچے اتھل پتھل جاری تھی اور پھر یہ اتھل پتھل یکا یک دنگل کی صورت اختیار کرگئی۔ اچانک لحاف سرک کر فرش پر جا گرا۔لحاف کے نیچے کی حقیقت سامنے آئی تو رحمان حیرت زدہ رہ گیا۔اسکی بہن راحلہ اپنی سہیلی عرشیہ کے ساتھ گتھم گتھا تھی۔ دونوں کے گورے چٹے ابھاروں سے پسینہ بارش کی ابتدائی پھواروں کی طرح ٹپک رہا تھا۔وہ گھبراہٹ کے عالم میں تیزی کے ساتھ اسٹول سے کودا تو اسکے ٹخنے میں چوٹ آگئی۔رحمان کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا اور بدن پر کپکپی طاری تھی۔ کچھ ڈگوں کے فاصلے پر اسکا بستر تھا مگر وہاں تک پہونچنا اسکے لئے دوبھر ہو گیا تھا جیسے کسی نے اسکے پیروں میں منوں وزنی پتھر باندھ دیے ہوں۔اسکا بدن پسینہ میں شرابور تھا گویا دسمبر کا مہینہ بھی مئی اور جون کی طرح تپ رہا ہو۔ وہ واپس بستر پر آکر اوندھے منہ لیٹ گیا۔تکیہ کے برابر میں رکھی کتاب پر اسکی نگاہیں ٹک گئیں کہ اب اسمیں مطالعہ کی تاب نہیں تھی۔کچھ دیر تک وہ یونہی بے حس وحرکت مردار کی طرح پڑا رہا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہو۔

کچھ دیر کی استراحت کے بعد اس نے تکیہ کے اوپر رکھی ہوئی ڈائری اٹھائی اور تحریر شدہ واقعہ کے نیچے اپنا تبصرہ محفوظ کیا۔

''ماضی اور حال میں بنیادی فرق وقت کے ساتھ عادت واطوار کا انقلاب ہے۔ورنہ حال میں بھی ماضی کی طرح بغیر ہل کے کھیت جوتے جاتے رہے تھے۔بنا کھاد اور پانی کے فصلیں اگانے کی کوشش ہوتی رہی ہے۔آج بھی جوان انہی مقاصد کے لئے مبعوث ہوتے ہیں کہ جیسے سدوم شہر میں ایک جوان کی بعثت نے انسانی فطرت کو ٹھینگا دکھایا اور ہم نے دیکھا کہ فطرت بھی بدل جاتی ہے۔اور یہ بدترین خلائق سے ہیں کہ جو اپنے اگلوں کی بری روش کی پیروی پر بھی فخر سمجھتے ہیں،تو خدا کہاں ہے اور اسکے فرشتے جو بستیوں کو درہم و برہم کرنے پر مامور ہوتے ہیں مگر آج کا خدا تو صرف رحمانیت کی جلوہ گری کا قائل ہے تو پھر عذاب سے بے خوف ایک دوسرے کی کھیتیاں جوتو اور خوب پانی دو یہاں تک کہ تمہارے ہل ٹیڑھے ہو جائیں''۔

ملحقہ کمرہ سے اب پلنگ کے چرچرانے کی آوازوں کی آمد کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔

اس نے کمرہ کی لائٹ بجھائی اور تکیہ کے بجائے کتاب پر سر رکھ کر سو گیا۔

❑❑❑

'نیا دور' کے جون ۲۰۱۷ء کے شمارے کی ایک جھلک

اردو کے دو عظیم فنکار راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر کی فلمی دنیا سے وابستگی پر محمد عالم اور شفیق احمد کے مضامین

ڈاکٹر نواز دیوبندی،نعمان شوق،خورشید اکبر،تارا اقبال،ڈاکٹر ظفر النقی اور ذوالفقار علی کی غزلیں

سراج اجملی اور فوزیہ فاروقی کی نظمیں

مشرف عالم ذوقی،ڈاکٹر مسرور صغریٰ،راجیو پرکاش ساحر اور ہلال نقوی کے افسانے

س.ر.یاتری کی ہندی کہانی،مراٹھی ناول 'ایندھن کی اگلی قسط'،گزشتہ لکھنؤ اور دیگر تخلیقات

غزل

اب جنوں سرحد امکاں سے سوا چاہتا ہے
شاخِ سدرہ پہ کوئی پھول کھلا چاہتا ہے

میرے ہر خواب کو پردے میں چھپا لیتا ہے
میرے ہمزاد! مری ذات سے کیا چاہتا ہے

اس سیاہی میں کسے نور ملا ہے پیارے
رات تو رات ہے تو رات سے کیا چاہتا ہے

ایک نادان پہاڑوں سے لڑا بن سوچے
دل شیریں دل فرہاد سے کیا چاہتا ہے

تمکنت ہوگئی مصلوب انا ٹوٹ گئی
جلد ہی لہجہ بھی فریاد ہوا چاہتا ہے

پھڑ پھڑاتا ہوا اک روح کا پاگل پنچھی
جسم کی قید سے آزاد ہوا چاہتا ہے

وقت کے دار پہ چڑھتا ہوا اک شوخ خیال
اپنے شاعر سے توجہ کی ضیا چاہتا ہے

توصیف خان
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی
موبائل: 9891547390

غزل

عدل و انصاف بھی کرتی تھی میں
اور مجرم بھی ٹھہرتی تھی میں

تجھ کو ترتیب عطا کرنے میں
روز تنکے سی بکھرتی تھی میں

تیرے اک جھوٹ کو سچ کرنے میں
اپنی ہستی سے مکرتی تھی میں

اب مجھے خوف نہیں ہے کوئی
تجھ کو کھونے سے ہی ڈرتی تھی میں

اب مجھے ہوش نہیں ہے اپنا
تیری خاطر ہی سنورتی تھی میں

تجھ کو معراج عطا کرنے میں
اپنے زینے سے اترتی تھی میں

سانس اب ٹوٹ رہی ہے ورنہ
روز اک موت تو مرتی تھی میں

لئیقہ سلطانہ
شیواجی نگر، گوونڈی، ممبئی
موبائل: 7977332017

مشاعرے

مرزا جعفر حسین

مملکت اودھ میں شجاع الدولہ کے عہد ہی سے باکمال شعراء کی قدردانی ہونے لگی تھی۔ آصف الدولہ کے زمانہ تک قریب قریب تمام بلند پایہ شعراء دلی سے لکھنؤ آ گئے تھے۔ ان میں میر تقی میرؔ اور مرزا رفیع سوداؔ کے ایسے استاد ان فن بھی یہیں کھنچ کر آئے اور اسی خاک کا پیوند ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ایسے تمام شعراء کے طرزِ فکر و بیان پر دلی ہی کا رنگ غالب تھا۔ سید انشاء، مصحفی، قتیل، رنگین اور جرأت نے دلی کے رنگ سخن کو ایک موڑ فراہم کیا گو کہ ان شعراء پر بھی دلی کا مذاق حاوی تھا لیکن پھر بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انہیں شعراء کے زمانہ سے لکھنؤ کا رنگ ابھرنا شروع ہو گیا تھا۔ ان کے بعد وہ دور آیا، جس میں ناسخؔ نے زبان کو جلا بخشی اور آتشؔ نے شاعری کو شیرینی و چاشنی سے بہرہ مند کیا۔ حالات بدلتے رہے اور فطری طور پر حالات سے شاعری بھی متاثر ہوتی رہی۔ دربار اور دربار کے اثر سے سماج میں جتنی جتنی تعیش پرستی بڑھتی گئی اتنی ہی شاعری بھی بلندیٔ فکر سے محروم ہو کر مائل بہ پستی ہوتی گئی تھی۔ وزیرؔ، رند، امیر، داغ اور جلال وغیرہم کا کلام اسی دور کے سماج کا آئینہ دار ہے۔ انتزاع سلطنت کے بعد جب ادبار آیا اور رفتہ رفتہ رجحانات و احساسات میں تبدیلی پیدا ہوئی تو شعرا بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ رنگ سخن میں انقلاب لانے کا خیال آیا تھا تو یہ انقلاب انتہائی شاندار طریقہ سے آیا اور مکتبۂ لکھنؤ میں ایک بلند پایہ فن نے جلوہ آرائی کی۔ یہ وہی زمانہ تھا جس کا تذکرہ ہم پیش کر رہے ہیں۔

'نہ روم، نہ اتھینس، نہ قسطنطنیہ اور نہ ہی کوئی دوسرا شہر اتنا دلکش اور دلفریب ہوگا جتنا یہ شہر'

۱۸۵۸ میں لندن کے ٹائمس اخبار کے نامہ نگار ولیم رسیل نے یہ جملہ لکھنؤ کے لئے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا تھا۔ سیدھے سادے لفظوں میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ نوابین اودھ کا عہد اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ پورے ہندوستان کے افق پر غالب تھا۔ لکھنؤ شہر کی شان و شوکت کے قصے عالمی سطح پر مشہور ہونے لگے تھے۔ نواب شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے دور کے لکھنؤ کو جتنی مقناطیسیت حاصل ہوئی، اتنی شائد ہی دوسرے کسی شہر کو نصیب ہوئی ہو۔

پھر وہ دور بھی آیا جب شاداب کلیاں بادِ سموم کے جھونکوں سے کمھلانے لگیں اور سارا ماحول تغیر پذیر ہو گیا۔ پرانی قدروں پر نیا مزاج حاوی ہونے لگا تب اس شہر کی ہیئت بدل گئی۔ لکھنؤ اپنے شاندار ماضی سے مستقل جوجھتا رہتا ہے، دور کوئی بھی ہو، شعراء، ادباء اور فنکاروں کی دلچسپی اب بھی اسی گزشتہ لکھنؤ میں زیادہ نظر آتی ہے۔

'دامن کو چھوڑتی ہی نہیں لکھنؤ کی خاک'

اسی کے پیش نظر 'نیا دور' کے ہر شمارے میں 'گزشتہ لکھنؤ' کے عنوان سے ایک نہ ایک ایسی تحریر پیش کی جائے گی جس میں خطۂ اودھ اور بالخصوص لکھنؤ کے ادبی و تہذیبی سماج کی عکاسی نظر آئے۔ مقصد بازیافت ہے۔ اس سلسلہ کی پہلی کڑی کے طور پر مرزا جعفر حسین کی ایک تحریر 'مشاعرے' حاضر ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ سلسلہ پسند کیا جائے گا۔ 'نیا دور' ایسی تمام تحریروں کا خیر مقدم کرے گا جن میں گزشتہ لکھنؤ کی جھلک نظر آئے۔

(ایڈیٹر)

شاعری کے رنگ میں انقلاب کا تصور سب سے پہلے اودھ پنچ نے پیش کیا تھا۔ وہ اخبار طنز و مزاح کے رنگ میں شائع ہوتا تھا لیکن اس کی ظرافت صحت مند تھی اور اس کا مسلک سماج کی اصلاح کرنا تھا۔ چنانچہ اودھ پنچ کی اس تحریک کا حسب مراد خیر مقدم ہوا اور انیسویں صدی کے اختتام پر مولانا سید علی نقی صفیؔ نے جن کے دوستانہ روابط اودھ پنچ کے ایڈیٹر اور دوسرے مقالہ نگاروں سے تھے، ایک منظم ادارہ کی دائرۂ ادبیہ کے نام سے تشکیل کر دی۔ چونکہ قدیم تخئیل اور زلف و گیسو کی شاعری سے دم الجھنے لگے تھے اس لئے تمام مشاہیر فن نے دائرہ کی رکنیت قبول کر لی۔ ان باکمال لوگوں میں منشی سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ، شیخ ممتاز حسین عثمانیؔ، مرزا محمد ہادی رسواؔ، پیارے صاحب رشیدؔ، مرزا کاظم حسین محشرؔ اور مقبول حسین ظریفؔ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ یہی حضرات صف اول میں تھے اور صفی اس تحریک کی روح رواں تھے۔ اس وقت سے شستگی اور پاکیزگی زبان اور بلندیٔ فکر و ندرت خیال پر زور دیا جانے لگا۔ چونکہ قریب قریب تمام مشاہیر دائرۂ ادبیہ میں شامل تھے اور جو عملاً شریک نہیں تھے انہوں نے بھی اس تحریک کو پسند کیا تھا اس لئے اس اقدام کو کامیاب بنانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ مشاعرے بھی اسی رنگ میں ہونے لگے اور دائرے کی جانب سے نیز اودھ پنچ کے کالموں میں تبلیغ و ترویج کا سلسلہ تیزی کے ساتھ شروع ہو گیا۔

صفیؔ نے اپنے چھوٹے بھائی مقبول حسین

ظریفؔ کے ذمہ یہ فریضہ عائد کر دیا تھا کہ وہ اودھ پنچ کے طرز پر ظریفانہ رنگ میں غزلیں کہا کریں جو قدیم تخیل کو دور کرنے اور جدید رنگ تغزل کو تقویت پہنچانے میں مدد و معاون ہوں۔ ظریفؔ خود بھی اپنے رنگ میں بہت اچھا کہتے تھے اس پر سونے پر سہاگہ وہ اصلاحیں ہوتی تھیں جو صفیؔ ان کے اشعار پر جب دیا کرتے تھے۔ یہ غزلیں جب مشاعروں میں پڑھی جاتی تھیں تو ان کے پائندہ اثرات دماغوں پر پڑنا لازمی ہو جاتا تھا۔ ظریفؔ کے چند اشعار نمونتاً پیش کئے جا رہے ہیں۔

داغ کے درہم و دینار بھرے ہیں جس میں
دل وہ کیونکر ہوا صراف کی تھیلی نہ ہوا

وہ ہو کیسا ہی دبلا تارِ بستر ہو نہیں سکتا
غلط ہر آدمی اس طرح لاغر ہو نہیں سکتا

خیالِ ہجر میں فرضی مریض غم کا مرجانا
یہ سب کیا ہے سلامت جھوٹ کے پل سے اتر جانا

کوشش ہو اٹھانے کی تو کیونکر نہ اٹھے گا
لنجے نہیں ہیں آپ جو خنجر نہ اٹھے گا

زلف کی شست میں پھنس جانے سے معلوم ہوا
دلِ بیتاب نہ ہوگا کوئی مچھلی ہوگا

عجائب گھر ہے باغِ حسن بھی اک قسم کا گویا
کہ دو ٹانگوں کا ہے جس میں صنوبر دیکھتے جاؤ

مجھے منظور پیمائش ہے طولِ شامِ ہجراں کی
بناؤں گر کہیں سے آنت جو مل جائے شیطاں کی

ادھر مشاعروں میں اصلاحات کا یہ سلسلہ جاری تھا تو دوسری طرف دائرہ ادبیہ میں زبان و بیان کی خوبیوں کا سقم کا جائزہ لیا جاتا تھا جو اساتذہ مشاعروں میں میر مجلس ہوتے تھے وہی دائرہ کے روح رواں تھے اس لئے ان کے فیصلے فی الفور اور بآسانی نافذ ہو جاتے تھے۔ ان مشاعروں کے انعقاد کے لئے ایک انجمن موسومہ معیارِ ادب کی تشکیل کر لی گئی تھی۔ اس کے بھی مولانا صفیؔ بانی تھے اور ہمیشہ صدر منتخب ہوتے رہے تھے۔ اس دوطرفہ جدوجہد کا بہت اچھا اثر پڑا تھا جس کی وضاحت کے لئے جوشؔ ملیح آبادی کی ایک غزل کا مقطع درج ذیل ہے۔ جوشؔ کے ابتدائی کلام میں یہ غزل شامل ہے انہوں نے قدیم رنگ تغزل سے تعبیر کیا تھا۔

کچھ نہیں اس کے سوا جوشؔ حریفوں کا کلام
وصل نے شاد کیا، ہجر نے ناشاد کیا

یہ مشاعرے ہر ماہ انجمن معیار ادب کے ہر مقتدر رکن کے یہاں یا اس کی جانب سے کسی دوسرے مقام پر باری باری ہوا کرتے تھے۔ نشست کا انتظام کسی بڑے ہال میں یا کسی انتہائی پرتکلف شامیانے میں جو کسی مخصوص غرض سے نصب کرایا جاتا تھا، ہوتا تھا۔ مشاعرے بعد نماز مغرب شروع ہوتے تھے اور نماز صبح کے قبل ختم ہو جاتے تھے۔ یہ التزام رہتا تھا کہ ہر شاعر کو اپنا کلام سنانے کا موقع مل جائے۔ شاعروں کو رات ہی کا وقت پسند خاطر ہوتا تھا لیکن دورِ آخر میں پرنس باقر علی خاں نے ایک بڑا مشاعرہ اپنے یہاں دن کو منعقد کیا تھا۔ پرنس موصوف خاندانِ شاہی کی ایک گرانقدر فرد تھے اور ان کی املاک ڈیوڑھی آغا میر اسٹیشن کے قریب چوک کے راستہ پر چڑھائی کی جانب بائیں جانب واقع تھی۔ ان کو شعر و سخن سے ذوق تھا اور مشاہیر فن سے دوستانہ روابط تھے اس لئے ان کی خاطر ہر ایک کو عزیز تھی۔ اس مشاعرہ کے علاوہ ایک یادگار شعری نشست دن کے وقت اس زمانے میں اور ہوتی تھی لیکن یہ دوشبانہ روز کا مسلسل مشاعرہ تھا جو تحسین گنج میں حامد علی خاں بیرسٹر کے یہاں منعقد ہوا تھا۔ اس مشاعرہ کی طرح 'دل سے'، 'بسمل سے' تھی۔ ثاقبؔ کی غزل حاصل مشاعرہ تھی۔ تین اشعار درج ذیل ہیں:

کسی کا رنج دیکھوں ہو نہیں سکتا مرے دل سے
نظر صیاد کی جھپکے تو کچھ کہہ دوں عنادل سے
چل اے ہمدم ذرا بزمِ طرب کا ساز بھی سن لے
اگر دل بیٹھ جائے گا تو اٹھ جائیں گے محفل سے
نہ سمجھا معنیٔ گور و کفن سمجھا تو یہ سمجھا
تھکا تھا میں لپٹ کر سو رہا دامانِ منزل سے

بزم مشاعرہ میں شعراء آمنے سامنے نیز داہنے اور بائیں مقابل صفوں میں بیٹھتے تھے۔ درمیانی جگہ خالی رہتی تھی۔ نشست میں باقی جگہ سامعین سے پر ہو جاتی تھی۔ زیادہ تر ایسا ہوتا تھا کہ مقام مشاعرہ سامعین کی کثرت سے ناکافی ہو جاتا اور باہر تک مجمع لگا رہتا تھا۔ تہذیب و آدابِ محفل میں یہ ضروری تھا کہ جو شاعر جس جگہ آ کر اور جس مخصوص طرز سے ایک بار بیٹھ جاتا وہ اسی طرح رات بھر بیٹھا رہتا۔ زانو اور پہلو بدلنا عیب میں داخل تھا۔ ہر مشاعرہ طرحی ہوتا تھا۔ بانیٔ مشاعرہ طرح دیتا تھا۔ انجمن معیار ادب کے ابتدائی دور میں مرزا غالبؔ کی زمینوں کی طرح دی جاتی تھیں اور انہیں کے قوافی پر طبع آزمائی ہوتی تھی۔ مشاعرہ بانیٔ بزم کی طرحی غزل سے شروع ہوتا اور اختتام بھی اسی کے چند اشعار پر ہو جاتا تھا۔ بانیٔ مشاعرہ طرحی غزل سنانے کے بعد آگے کی شمع داہنے جانب کے شاعر کے آگے بڑھا دیتا تھا۔ اسی طرح ہر شاعر غزل سنا کر دوسرے کے آگے شمع بڑھاتا رہتا تھا۔

بزم مشاعرہ میں شعراء آمنے سامنے نیز داہنے اور بائیں مقابل صفوں میں بیٹھتے تھے۔ درمیانی جگہ خالی رہتی تھی۔ نشست میں باقی جگہ سامعین سے پر ہو جاتی تھی۔ زیادہ تر ایسا ہوتا تھا کہ مقام مشاعرہ سامعین کی کثرت سے ناکافی ہو جاتا اور باہر تک مجمع لگا رہتا تھا۔ تہذیب و آدابِ محفل میں یہ ضروری تھا کہ جو شاعر جس جگہ آ کر اور جس مخصوص طرز سے ایک بار بیٹھ جاتا وہ اسی طرح رات بھر بیٹھا رہتا۔ زانو اور پہلو

بدلنا عیب میں داخل تھا۔ ہر مشاعرہ طرحی ہوتا تھا۔ بانیٔ مشاعرہ طرح دیتا تھا۔ انجمن معیار ادب کے ابتدائی دور میں مرزا غالبؔ کی زمینوں کی طرح دی جاتی تھیں اور انہیں کے قوافی پر طبع آزمائی ہوتی تھی۔ مشاعرہ بانیٔ بزم کی طرحی غزل سے شروع ہوتا اور اختتام بھی اسی کے چند اشعار پر ہو جاتا تھا۔ بانیٔ مشاعرہ طرحی غزل سنانے کے بعد آگے کی شمع داہنے جانب کے شاعر کے آگے بڑھا دیتا تھا۔ اسی طرح ہر شاعر غزل سنا کر دوسرے کے آگے شمع بڑھاتا رہتا تھا یہاں تک کہ شمع دان میں جلتی ہوئی شمع پھر اسی منزل تک آجاتی جہاں سے وہ چلائی گئی تھی۔ اب صبح کے آثار نمودار ہو جاتے تھے اور مشاعرہ ختم ہو جاتا تھا۔ عندالضرورت شمعدان بدلنے کا بھی انتظام رہتا تھا۔ اس دور کے مشاعرے لکھنؤ کے آداب وتہذیب اور ثقافت وتکلفات کی جیتی جاگتی تصویریں ہوا کرتے تھے۔ نومشق اور نوجوان شمع آنے کا بیقراری سے انتظار کرتے اور باری آنے پر فی الفور غزل سنانا شروع کر دیتے تھے۔ معمر اساتذہ غزل پڑھنے میں طرح طرح کے عذر کرتے تھے۔ کوئی خرابیٔ صحت تو کوئی گلوگرفتگی کا شکوہ کرتا۔ کوئی یہ کہہ کر معذرت کرتا کہ عدیم الفرصتی کے باعث یا دوسری پریشانیوں کے سبب سے سنانے کے قابل غزل تیار نہ ہو سکی۔ ادھر سے عذرات پیش ہوتے تو سامعین اور دیگر شعراء اصرار کا طومار باندھ دیتے تھے۔ بالآخر غزل سنائی جاتی تھی۔ پڑھنے کا انداز بھی اسی زمانہ کے ساتھ مخصوص تھا۔ تحت اللفظ کے اس طرز میں اگر آج مشاعروں میں کوئی غزل پڑھی جائے تو شاعر کی جان کوسیٹیوں اور پھبتیوں کی گونج میں ایک عتاب جھیلنا پڑے گا۔ کسی شاعر کے الفاظ میں ٹھہراؤ تو کسی کے لہجے میں کٹاؤ ہوتا تھا۔ محشرؔ مرحوم الفاظ اور فقروں کو توڑ توڑ کر اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے تھے۔ بعض شعراء زبان سے الفاظ ادا کرنے میں تلفظ اور صوتِ حروف کا پورا پورا خیال رکھتے تھے۔ بعض میں یہ ہنر تھا کہ وہ اپنی آنکھوں کے رنگ اور چہرے کے چڑھاؤ اتار سے سامعین پر شعر کا مفہوم واضح کر دیتے تھے۔ حکیم فدا احمد دانشؔ اس ہنر میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ثاقبؔ کا انداز نرالا تھا۔ ان کی آواز میں فطری گداز تھا اور ان کا چہرہ ہمیشہ غمگین نظر آتا تھا۔ اس لئے ان کے پڑھنے اور رونے میں امتیاز مشکل تھا۔

غزل پڑھنے کا انداز بھی اسی زمانہ کے ساتھ مخصوص تھا۔ تحت اللفظ کے اس طرز میں اگر آج مشاعروں میں کوئی غزل پڑھی جائے تو شاعر کی جان کو سیٹیوں اور پھبتیوں کی گونج میں ایک عتاب جھیلنا پڑے گا۔ کسی شاعر کے الفاظ میں ٹھہراؤ تو کسی کے لہجے میں کٹاؤ ہوتا تھا۔ محشرؔ مرحوم الفاظ اور فقروں کو توڑ توڑ کر اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے تھے۔ بعض شعراء زبان سے الفاظ ادا کرنے میں تلفظ اور صوتِ حروف کا پورا پورا خیال رکھتے تھے۔ بعض میں یہ ہنر تھا کہ وہ اپنی آنکھوں کے رنگ اور چہرے کے چڑھاؤ اتار سے سامعین پر شعر کا مفہوم واضح کر دیتے تھے۔ حکیم فدا احمد دانشؔ اس ہنر میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ثاقبؔ کا انداز نرالا تھا۔ ان کی آواز میں فطری گداز تھا اور ان کا چہرہ ہمیشہ غمگین نظر آتا تھا۔ اس لئے ان کے پڑھنے اور رونے میں امتیاز مشکل تھا۔ غنائیت سے بہرحال کسی کو کوئی سروکار نہیں تھا۔ مولانا صفی کی وہ واحد ذات تھی جو لحن میں غزل پڑھتے تھے۔

غنائیت سے بہرحال کسی کو کوئی سروکار نہیں تھا۔ مولانا صفی کی وہ واحد ذات تھی جو لحن میں غزل پڑھتے تھے لیکن پھر بھی ان کے پڑھنے کا وہی اسلوب تھا جو خود انہوں نے حسب ذیل شعر میں واضح کر دیا تھا۔

یہ حسن صوت گو مرغوب ہے طرزِ غزل خوانی
نہ لیکن یوں کہ سمجھیں اک مغنی نکتہ داں مجھ کو

اسی مقام پر یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ باوجود 'حسن صوت' اور لحن کے یہ ضروری نہ تھا کہ ان کے ہر شعر کی جا و بے جا تعریف بھی ہوتی ہو۔ شاعر اگر ہنرمند تھے تو اس دور کے سامعین بھی نکتہ داں تھے۔ حقیقی توصیف کا فرق سر مشاعرہ ہی واضح ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کبھی کبھی نوکار اور نوجوان غزل گو مشاعرے سے پوری پوری دادِ سخن وصول کر لیا کرتے تھے۔

اشعار کی تعریف کرنا بھی اخلاقیات میں داخل تھا۔ اساتذہ اس فریضہ کو اپنے حسب مراتب ادا کرتے تھے۔ شاگرد اپنے استاد کے ہر ہر شعر کی تعریف کرتے تھے لیکن اصل تعریف وہی سمجھی جاتی تھی جس کی آوازیں سامعین کی صفوں سے بلند ہوتی تھیں جس کا جو شعر پسند کیا جاتا وہ بار بار پڑھوایا جاتا اور دل کھول کر دادِ سخن دی جاتی تھی۔ جس استاد کی غزل میں زیادہ اشعار کی تعریف ہوتی تھی اس کے بارے میں یہ اصطلاح رائج تھی کہ فلاں فلاں شاعر نے 'مشاعرہ لوٹ لیا'۔ غزل کے اشعار کی تعداد کا رسمی طور پر تعین ہو جاتا تھا۔ شعرا کی تعداد زیادہ ہوتی تو زیادہ سے زیادہ نو اشعار کی غزل پڑھی جاتی تھی ورنہ گیارہ اشعار تک اوسط درجہ کی غزل کے لئے کافی سمجھے جاتے تھے۔ اس طرح جس شاعر کے چار پانچ اشعار بھی بلند پایہ قرار پا جاتے اسی کے سر مشاعرہ لوٹنے کا سہرا بندھ جاتا تھا۔ سخن شناس مجمع کی تحسین وآفریں پر شعرا کے لئے اظہار تشکر و امتنان بھی ضروری تھا۔ چنانچہ یہ لوگ برابر آداب وتسلیمات بجا لایا کرتے تھے۔ اساتذہ کی زیادہ تعریف ہوتی تھی۔ وہ لوگ انتہائی پر وقار انداز میں اپنی ہیچ مدانی کا اظہار کرتے تھے۔ 'میں کس قابل ہوں'، 'آپ کی ذرہ نوازی ہے'۔ قدردانی کا جواب کچھ ایسے ہی فقروں میں دیا جاتا تھا۔ ایک بزرگ جناب کلیمؔ تھے۔ وہ اچھے شاعر تھے لیکن ان کا ہر انداز اپنی آپ مثال تھا۔ صورت وشکل میں وہ کسی قدر کریہہ منظر

تھے۔ ان کے سیاہ رنگ، پستہ قامت، گٹھے جسم، پھولے ہوئے گالوں اور ان کی گول گول آنکھوں کا تمسخر کرتے ہوئے ان کے بے تکلف دوست ان کو بھینس کا انڈا کہا کرتے تھے۔ یہ لقب کس خصوصیات کی بنا پر دیا گیا تھا اس کا کوئی پتہ راقم کو کبھی نہیں چل سکا۔ بہرحال ان کا مشاعروں میں یہ طرز رہا کرتا تھا کہ وہ جذبات میں ڈوب کر شعر پڑھتے اور فوراً پیچھے کی طرف پلٹ جاتے۔ اس اثنا میں تعریفیں ہوتی تھیں پھر وہ اسی تیزی سے لوٹ کر اور جھوم جھوم کر تحسین و آفریں کا ہر سمت علیٰحدہ علیٰحدہ الفاظ میں شکریہ ادا کرتے تھے۔ تسلیم، تسلیمات، آداب، کورنش، نوازش، مجرا عرض ہے وغیرہ وغیرہ۔ اسی نعرہائے تحسین اور اظہار تشکر کے دوران کچھ فقرہ بازیاں بھی ہو جایا کرتی تھیں اور سامعین کی صفوں میں کبھی کبھی قہقہوں کی آوازیں بھی بلند ہوتی تھیں لیکن اساتذہ اور مشاہیر فن ہمیشہ منھ پر رومال رکھ کر ہلکا سا تبسم فرما لیتے تھے۔

ہر مشاعرے کے بعد تمام غزلوں کا ایک گلدستہ شائع ہوتا لیکن کسی کی کوئی غزل سلسلہ وار پیش نہیں کی جاتی تھی۔ اشعار کی ترتیب قافیہ وار ہوتی تھی اور ہر شعر کے دونوں مصرعوں کے درمیان شاعر کا تخلص درج رہتا تھا تاکہ پڑھنے والوں کو موازنہ کرنے میں آسانی رہے۔ یہ گلدستہ ارکان انجمن کو بلا قیمت نذر کیا جاتا تھا باقی جلدیں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتی تھیں۔ سامعین مشاعرہ اپنی اپنی پسند کے اشعار یاد کر لیتے تھے۔ ان کی وساطت سے نیز گلدستہ کی مدد سے شہر بھر میں ایک مشاعرے کے بعد سے دوسرے مشاعرے تک اشعار پر مذاکرے اور مباحثے ہوا کرتے تھے، تعریف و توصیف ہوتی تھی۔ نکتہ چینیاں ہوتی تھیں اور تنقید و تبصرے بھی ہوا کرتے تھے۔ وارد کردہ اعتراضات شاگردوں کی وساطت سے یا کسی نہ کسی اور ذریعہ سے شعراء اور اساتذہ کے گوش گزار ہو جاتے تھے۔ پھر ان کے جوابات اور صفائیاں بھی کسی نہ کسی وسیلے سے بازار میں آ جاتی تھیں۔

اس زمانے میں لکھنؤ کے در و دیوار شعریت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ایسی بحثیں بہت ہوا کرتی تھیں اور یہ حقیقت بھی ہے کہ زبان کی نکھار اور خیال کی نزاکت میں یہ مذاکرے بہت کارآمد تھے۔ اس طرح ان مشاعروں کو زبان و بیان کی خوبیوں کے حق میں درسگاہ کہنا صحیح ہوگا۔

اسی سلسلہ میں وہ ہنگامہ آرائیاں بھی قابل ذکر ہیں جو ۱۹۱۱ء کے بعد ظہور پذیر ہوئی تھیں جب یاسؔ عظیم آبادی ثم یگانہؔ چنگیزی عظیم آباد سے آ کر لکھنؤ بس گئے تھے۔ وہ ایک یقینا بلند پایہ شاعر تھے اور شعریت میں ڈوب کر بڑے دلکش لہجہ میں غزل پڑھتے تھے۔ ان کو مشاعروں میں بہت جلد شرف قبولیت حاصل ہو گیا تھا لیکن وہ یہاں کے مسلم الثبوت اساتذہ سے میل نہیں کھا سکے۔ ان کو یہ زعم تھا کہ وہ سب سے بہتر اوعر برتر شاعر تھے مگر یہاں کے اساتذہ ان کے بیرونی ہونے کی وجہ سے ان کو ان کا جائز مقام دینے پر تیار نہ تھے۔ اس احساس سے اس میں بددلی پیدا ہوئی جس نے ان کے مغلوب الغضب ہونے کے سبب سے مجادلہ کی شکل اختیار کی لی تھی۔ صلح مندی، آشتی اور حسن تدبیر سے کام لینے کے بجائے انہوں نے وہ لب و لہجہ اختیار کیا اور ایسی بدزبانیاں کیں جن کو لکھنؤ کی شائستگی و تہذیب کسی طرح گوارا نہیں کر سکتی تھی۔

اسی سلسلہ میں وہ ہنگامہ آرائیاں بھی قابل ذکر ہیں جو ۱۹۱۱ء کے بعد ظہور پذیر ہوئی تھیں جب یاسؔ عظیم آبادی ثم یگانہؔ چنگیزی عظیم آباد سے آ کر لکھنؤ بس گئے تھے۔ وہ ایک یقینا بلند پایہ شاعر تھے اور شعریت میں ڈوب کر بڑے دلکش لہجہ میں غزل پڑھتے تھے۔ ان کو مشاعروں میں بہت جلد شرف قبولیت حاصل ہو گیا تھا لیکن وہ یہاں کے مسلم الثبوت اساتذہ سے میل نہیں کھا سکے۔ ان کو یہ زعم تھا کہ وہ سب سے بہتر اور برتر شاعر تھے مگر یہاں کے اساتذہ ان کے بیرونی ہونے کی وجہ سے ان کو ان کا جائز مقام دینے پر تیار نہ تھے۔ اس احساس سے اس میں بددلی پیدا ہوئی جس نے ان کے مغلوب الغضب ہونے کے سبب سے مجادلہ کی شکل اختیار کی لی تھی۔ صلح مندی، آشتی اور حسن تدبیر سے کام لینے کے بجائے انہوں نے وہ لب و لہجہ اختیار کیا اور ایسی بدزبانیاں کیں جن کو لکھنؤ کی شائستگی و تہذیب کسی طرح گوارا نہیں کر سکتی تھی۔

اس نبرد آزمائی کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ چونکہ یہاں کے اساتذہ پیرؔ و میرؔ و غالبؔ تھے، یاسؔ نے آتش کو سراہا، اپنے کو آتش پرست قرار دیا اور اسی کے ساتھ غالبؔ منقصت اور توہین کو اپنا شعار بنا لیا۔ یہاں کے تمام سربرآوردہ شعراء کو 'غلیچیون' کا لقب بخش دیا۔ یہ مجادلہ اسی منزل پہ ختم نہیں ہوا بلکہ ایک ایک استاد کو علیٰحدہ علیٰحدہ صلواتیں سنائیں اور سب کو اپنا مخالف بنا لیا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دوستوں نے بھی ایک ایک کر کے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور جو چھوٹا اس کو انہوں نے فوراً تبر ملامت کا نشانہ بنایا۔ بیخودؔ مرحوم سے پہلے بہت گہرے دوستانہ تعلقات تھے پھر ان کو بھی 'حرصی ٹٹو' اور 'میاں ٹھینگا' کے خطابات عطا ہوئے۔ اساتذہ میں سب سے زیادہ تر بزرگ و محترم مولانا صفیؔ تھے۔ ان کی شان میں یہ کلمات استعمال ہوئے: 'ایک تو وہ ہیں جن کا جوبن تو ڈھل چکا ہے مگر چتون کی خونخواری جو پہلے تھی وہ اب بھی ہے۔'

پھر بھی یہ تہذیب یادگار رہے گی کہ یاس کی ان بدزبانیوں اور ان کے ان مجادلوں کا کبھی کوئی خراب اثر کسی مشاعرہ پر نہیں پڑا۔ یہ ہنگامہ

آرائیاں ہوتی رہیں لیکن مشاعروں میں یاس کو ان کے حسب دلخواہ نہ سہی مگر ان کے ہر اچھے شعر پر برابر داد ملتی رہی تھی۔ مثال کے طور پر یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ ایک مشاعرہ میں یاسؔ نے حسب ذیل مطلع پڑھا تھا تو مولانا صفیؔ نے بلند آواز سے فرمایا تھا: 'پھر ارشاد ہو۔'

مزا گناہ کا جب تھا کہ باوضو کرتے
بتوں کو سجدہ بھی کرتے تو قبلہ رو کرتے

ان کے سر میں بہرحال اپنے 'استادیگانہ' ہونے کا اتنا شدید سودا تھا کہ وہ ایسی ہلکی پھلکی تعریفوں کو درخود اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ مشاعروں میں اساتذہ کے شاگرد تعریفوں سے چھتیں اڑا دیتے تھے مگر ان کو یہ فضیلت کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی اس لئے ان کی مایوسیوں کی کوئی انتہا باقی نہیں رہ گئی تھی جس کے نتیجہ میں ان کی بدزبانی بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ انہوں نے عزیزؔ لکھنوی کی ہجو میں ایک رسالہ شائع کر دیا جس کی مکافات ان کو بہت سخت بھگتنا پڑی۔ مطبع نول کشور کی ملازمت سے سبکدوش ہوکر بیروزگاری کے عالم میں لکھنؤ چھوڑنا پڑا جس کا ان کو بہت دکھ ہوا۔ انہوں نے خود بھی بہت دکھ اٹھائے اور یہاں کے مشاعروں کی رونق بھی کم ہوگئی مگر ان کے طنطنہ میں فرق نہ آیا۔ باہر سے وہ مجادلہ برقرار رکھے رہتے تھے۔ ایک مدت کے بعد وہ پھر واپس آئے لیکن یہ وہ وقت تھا جب لکھنؤ کی بساطِ شعروادب پرشکن ہوچکی تھی اور یہاں کی مسند وقار و تہذیب لٹ چکی تھی۔ اس مرتبہ ان کو بعض نازیبا حرکتوں کی سختیاں بھی جھیلنا پڑیں لیکن لکھنؤ والوں سے خفا رہتے ہوئے بھی ان کو یہیں کی خاک کا پیوند ہونا تھا اور وہی ہوکر رہا۔

بیسویں صدی کے اوائل ہی میں انجمن معیارِ ادب کے ممبروں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی اور ان شعراء کی تعداد برابر بڑھتی ہی رہی۔ صف اول کے شعراء میں صفیؔ، ثاقبؔ، محشرؔ، آرزوؔ، ظریفؔ پہلے ہی سے موجود تھے۔ آہستہ آہستہ بیخودؔ، عزیزؔ، اثرؔ، دانشؔ، ہاتفؔ، چکبستؔ، نوبتؔ رائے نظرؔ، کلیمؔ، سراجؔ، منظرؔ، حکیم آشفتہؔ، ملاؔ، قدیرؔ وغیرہم کا بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ ان میں ہر ایک کے شاگرد بھی تھے۔ فطری طور پر بدمزگیاں پیدا ہوتی گئیں۔ اس کے بعد کئی انجمنیں بیک وقت اور کچھ یکے بعد دیگرے معرض وجود میں آئیں اور فنا ہوتی گئیں۔

بیسویں صدی کے اوائل ہی میں انجمن معیارِ ادب کے ممبروں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی اور ان شعراء کی تعداد برابر بڑھتی ہی رہی۔ صف اول کے شعراء میں صفیؔ، ثاقبؔ، محشرؔ، آرزوؔ، ظریفؔ پہلے ہی سے موجود تھے۔ آہستہ آہستہ بیخودؔ، عزیزؔ، اثرؔ، دانشؔ، ہاتفؔ، چکبستؔ، نوبتؔ رائے نظرؔ، کلیمؔ، سراجؔ، منظرؔ، حکیم آشفتہؔ، ملاؔ، قدیرؔ وغیرہم کا بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ ان میں ہر ایک کے شاگرد بھی تھے۔ فطری طور پر بدمزگیاں پیدا ہوتی گئیں۔ انجمن معیارادب پہلے ہی خانہ جنگیوں کی نذر ہوچکی تھی۔ اس کے بعد کئی انجمنیں بیک وقت اور کچھ یکے بعد دیگرے معرض وجود میں آئیں اور فنا ہوتی گئیں۔ بالآخر ایک انجمن جس نے کچھ مدت تک استقامت کا مظاہرہ کیا، انجمن معراج الادب تھی۔

انجمن معیارِادب کے سربرآوردہ اراکین اس انجمن میں شریک تھے لیکن جب لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت نے اس صدی کی تیسری دہائی میں دم توڑا تو یہ انجمن بھی ختم ہوگئی اور اس کے ساتھ قدیم مشاعروں کی بہاروں پر بھی خزاں آگئی۔ اس انجمن کا آخری مشاعرہ محلہ چاندی خانہ متصل جبلی کالج نواب سید محمد کے یہاں ہوا تھا۔ طے ہوچکا تھا کہ وہ آخری مشاعرہ ہے اس لئے ساری محفل پر افسردگی طاری تھی۔ رات بھر گرمئ محفل کسی نہ کسی طرح برقرار رہی لیکن آخر وقت جب شمع حکیم فدا احمد دانشؔ کے آگے پہنچی تو انہوں نے ایسا مطلع پڑھ دیا کہ انجمن مجلس غم میں تبدیل ہوگئی۔ انجمن کا آخری مشاعرہ پڑھنے والا آخری شاعر اور وہ بھی ضعیف العمر اور نابینا تھا۔ ان تمام حالات کے پیش نظر ان کا یہ مطلع تمام حاضرین کو رلا گیا تھا۔

دیکھ سکتا ہوں نہ ساقی کو نہ میخانہ کو
آخری دور ہے بھر دے کوئی پیمانے کو

❑❑❑

'نیادور' کو ایسی ادبی تخلیقات کا شدت سے انتظار ہے جو نہ صرف دلچسپ بلکہ معلوماتی بھی ہوں۔ ایسی تخلیقات جو اعلیٰ درجے کے ادبی شہ پاروں کی حیثیت رکھتی ہیں مگر عام قاری کی دلچسپی سے عاری ہوں تو اسے 'نیادور' اپنی اشاعتی ترجیحات میں شامل کرنے سے گریز کرے گا کیونکہ معاملہ دراصل اردو کے فروغ کا ہے۔ اردو محض یونیورسٹیوں کے شعبوں، تحقیقی اداروں اور دیگر اردو مراکز تک اپنی مخصوص ضرورتوں کے تحت محدود رہے، اس روش سے بہرحال پرہیز کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ہم سب کا اولین فریضہ ہے کہ اردو زبان کے فروغ میں پوری تندہی کے ساتھ شامل رہیں اور عام قاری سے اردو کے مراسم کو استوار کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

غزل

میانِ مقتل لہو بہانے کی رُت نہیں ہے
یہ دل کے جذبوں کو آزمانے کی رُت نہیں ہے

یہ لوٗ کا موسم ہے گھر سجانے کی رُت نہیں ہے
گلاب چہروں کے مسکرانے کی رُت نہیں ہے

ابھی مری جاں اجاڑ آنکھوں کے طاقچوں پر
بیادِ ماضی دیئے جلانے کی رُت نہیں ہے

لکھا جو ہم نے کہ لوٹ آؤ بچھڑنے والوں
جواب آیا کہ لوٹ آنے کی رُت نہیں ہے

نہ خون تھوکو، ہماری ہستی کے کینوس پر
یہ شوخ رنگوں کے جھلملانے کی رُت نہیں ہے

ابھی ہواؤں میں بوٗ ہے بارود کی جوانوں
ابھی محبت کے گیت گانے کی رُت نہیں ہے

کوئی تو دیدارؔ جا کے اہلِ جنوں سے کہہ دے
نہ خاک اڑاؤ یہ خاک اڑانے کی رُت نہیں ہے

دیدارؔ اکبرپوری
سبزی منڈی، چوک، لکھنؤ
موبائل: 9795555093

غزل

میرے اعمال کی ساری کمی بول اٹھے گی
بدن سے آتما کی جب رہائی بول اٹھے گی

مرے طرزِ تکلم سے ابھی مبہوت ہے دنیا
میں چپ ہوجاؤں تو ساری خدائی بول اٹھے گی

رقم جب وارداتِ قلب کردوں گا ان آنکھوں میں
تو کاغذ پر لہو کی روشنائی بول اٹھے گی

تمہارے لمس سے گزرے دنوں کی یاد آتی ہے
بدن کی جھریوں سے کل چھوائی بول اٹھے گی

بجے گی جب مرے دل میں تری یادوں کی شہنائی
تو پھر شہنائی کی نغمہ سرائی بول اٹھے گی

حیا کا آخری گہنہ اتارا ہے شرافت نے
اب اس دنیا میں اسکی بے وفائی بول اٹھے گی

ترا پیکر مرے لفظوں کی بندش میں نہ آیا تو
میرے حساس دل کی بے صدائی بول اٹھے گی

سنجےؔ مصرا شوق
231 / کھ538، دین دیال نگر، سیتا پور روڈ، لکھنؤ
موبائل: 9795455897

لال پان کی بیگم

فنیشور ناتھ رینو
۱۹۲۱ ۱۹۷۷

'کیوں برجو کی ماں، ناچ دیکھنے نہیں جائے گی کیا؟'

برجو کی ماں شکر قند ابال کر بیٹھی من ہی من ہی کڑھ رہی تھی اپنے آنگن میں سات سال کا لڑکا برجو شکر قند کے بدلے تماچے کھا کر آنگن میں لوٹ لوٹ کر سارے جسم میں مٹی مل رہا تھا۔ چمپا کے سر بھی چڑیل منڈرا رہی ہے.....آدھ آنگن دھوپ رہتے جو آ گئی ہے سہوآئن کی دوکان چھووا۔ گڑ لانے، سوا بھی تک نہیں لوٹی، دیاباتی کی بیلا ہوگئی۔ آئے آج لوٹ کے ذرا! باگڑ بکرے کی دیجہ/جسم میں لکر ماچھی تھی، اس لئے بیچارہ باگڑ رہ رہ کر کوند پھاند کر رہا تھا۔ برجو کی ماں باگڑ پر من کا غصہ اتارنے کا بہانا ڈھونڈ کر نکال چکی تھی۔

پچھواڑے کی مرچ کی پھولی گاچھ! باگڑ کے سوا اور کسنے کلیوا کیا ہوگا! باگڑ مارنے کیلئے وہ مٹی کا ایک چھوٹا ڈھیلا اٹھا چکی تھی کہ پڑوسن ملھنی پھووا پکار سنائی پڑی، 'کیوں برجو کی ماں، ناچ دیکھنے نہیں جائے گی کیا؟'

'برجو کی ماں کے آگے ناتھ اور پیچھے پگہیا نا ہو تب نا پھووا!'

گرم غصے میں بجھی نکیلی بات پھوا کا جسم میں دھنس گئی اور برجو کی ماں نے ہاتھ کے ڈھیلے کو پاس ہی پھینک دیا۔ بیچارے باگڑ کو مکر ماچھی پریشان کر رہی ہے! آہا، آئے .....آئے! ہرر-ر-ر! آئے-آئے!

برجو نے لیٹے ہی لیٹے باگڑ کو ایک ڈنڈا لگا دیا۔ برجو کی ماں کی خواہش ہوئی کہ جا کر اسی ڈنڈے سے برجو کا بھوت بھگا دے، مگر نیم کے پاس کھڑی پن بھرنیوں کی کھلکھلاہٹ سن کر رک گئی۔ بولی:

'ٹھہر، تیرے بپّا نے بڑا ہتھ چھٹا بنا دیا ہے تجھے! بڑا ہاتھ چلتا ہے لوگوں پر۔ ٹھہر!'

فنیشور ناتھ رینو کا شمار ہندی کے مایۂ ناز ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ان کی کہانیاں اور ناول بہار کے دیہی علاقوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کی زبان میں قصہ گوئی کے عنصر نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ 'میلا آنچل' ان کا شہرۂ آفاق ناول ہے۔ ان کی کہانیوں پر کئی فلمیں بھی بنیں، فلموں میں ان کے نغمے بھی مشہور ہوئے۔ 'نیا دور' کے ہر شمارہ میں ایک ہندی کہانی کے سلسلہ کے طور پر رینو کی 'لال پان کی بیگم' کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے جس کا اردو ترجمہ 'نیا دور' کے مشہور و معروف ادیب ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی نے کیا ہے۔

(ایڈیٹر)

ملھنی پھووا نیم کے پاس جھکی کمر سے گھڑا اتار کر پانی بھر کر لوٹتی پن بھرنیوں سے برجو کی ماں کی بہکی ہوئی بات کا انصاف کر رہی تھی، 'ذرا دیکھو تو اس برجو کی ماں کو! چار من پاٹ (جوٹ) کا پیسہ کیا ہوا ہے، زمین پر پاؤں ہی نہیں پڑتے! انصاف کرو! خود اپنے منھ سے آٹھ دن پہلے سے ہی گاؤں کی گلی گلی میں بولتی پھرلی ہے، ہاں، اس بار برجو کے بپا نے کہا ہے، بیل گاڑی پر بیٹھا کر بلرامپور کا ناچ دکھالاؤں گا۔ بیل اب اپنے گھر ہیں، تو ہزار گاڑی منگنی مل جائے گی۔ سو میں نے ابھی ٹوک دیا، ناچ دیکھنے والی سب تو اون-پون کر کے تیار ہو رہی ہیں، رسوئی پانی کر رہی ہیں۔ میرے منھ میں آگ لگے، کیوں میں ٹوکنے گئی! سنتی ہو کیا جواب دیا برجو کی ماں نے!'

ملھنی پھووا نے اپنے پوپلے منھ کے ہونٹوں کو ایک جانب موڑ کر اینٹھتی ہوئی بولی نکالی اررے ہاں! برجو کی میں..... یا کے آگے ناتھ اور پیچھے پگہیا نا ہو، تب نا آ-آ!'

جنگی کی پتوہو برجو کی ماں سے نہیں ڈرتی۔ وہ ذرا گلا کھول کر ہی کہتی ہے، 'پھووا۔ آ! سر بے ستّل منٹی (سروے سیٹل منٹ) کے حاکم کے باسا پر پھول چھاپ کناری والی ساڑی پہن کے اگر تو بھی بھینٹی کی بھنٹی چڑھاتی تو تمہارے نام سے بھی دو تین بیگھا گھنہر زمین کا پرچہ کٹ جاتا! پھر تمہارے گھر بھی آج دس من سونا بنگ پاٹ ہوتا، جوڑا بیل خریدتی! پھر آگے ناتھ اور پیچھے سینکڑوں پگہیا جھولتی!'

جنگی کی پتوہو منھ زور ہے۔ ریلوے اسٹیشن کے پاس کی لڑکی ہے۔ تین ہی مہینے ہوئے گونے کی نئی بہو ہو کر آئی ہے اور ساری کرماٹولی کی سبھی جھگڑالو ساسوں سے ایک آدھ مورچہ لے چکی ہے۔ اس کا سسر جنگی داغی چور ہے، سیٹر کلاسی ہے۔ اس کا گھسم رنگی کرماٹولی کا نامی لٹھیت۔ اسی لیئے ہمیشہ سینگ گھماتی

پھرتی ہے جنگی کی پتو ہو!

برجو کی ماں کے آنگن میں جنگی کی پتو ہو کی گلا کھول بولی گلیل کی گولیوں کی طرح دندناتی ہوئی آئی۔ برجو کی ماں نے ایک تیکھا جواب تلاش نکالا، لیکن من مسوس کر رہ گئی۔ گوبر کی ڈھیری میں کون ڈھیلا پھینکے!

زبان کے جھال کو گلے میں اتار کر برجو کی ماں نے اپنی بیٹی چمپیا کو آواز دی:

اری چمپیا - یا - یا -، آج لوٹے تو تیری موڑی مروڑ کر چولہے میں جھونکتی ہوں! دن - دن بیچال ہوتی جاتی ہے!.....گاؤں میں تو اب ٹھیٹھر بیس کوپ کا گیت گانے والی پسریہ پتو ہو سب آنے لگی ہیں۔ کہیں بیٹھ کے 'باجے نامرلیا' سیکھ رہی ہوگی ہا - ر - جا - ای - ای! اری چمپ یا - یا - یا!

جنگی کی پتو ہو نے برجو کی ماں کی بولی کا سواد لے کر کمر پر گھڑے کو سنبھالا اور مٹک کر بولی، چل دد یہ چل! اس محلے میں لال پان کی بیگم بستی ہے! نہیں جانتی، دوپہر - دن اور چوپہر رات بجلی کی بتی بھک بھک کر جلتی ہے!'

بھک بھک بجلی بتی کی بات سن کر نہ جانے کیوں سبھی کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ پھووا کی ٹوٹی ہوئی دنت پنکتیوں/دانت کی لائینوں کے بیچ (دانت کی لائنوں کے درمیان) سے ایک میٹھی گالی نکلی، 'شیطان کی نانی!'

برجو کی ماں کی آنکھوں پر مانو کسی نے تیز ٹارچ کی روشنی ڈال کر چوندھیا دیا۔.....بھک بھک بجلی بتی! تین سال پہلے سروے کیمپ کے بعد گاؤں کی جلن ڈھائی عورتوں نے ایک کہانی گڑھ کے پھیلائی تھی، چمپیا کی ماں کے انگن میں رات بھر بجلی بتی بھک بھکاتی تھی! چمپیا کی ماں کے آنگن میں، نال والے جوتے کی چھاپ گھوڑے کی ٹاپ کی طرح!.....جلو، جلو! اور جلو! چمپیا کی ماں کے آنگن میں چاندی جیسے پاٹ سوکھتے دیکھ کر جلنے والی سب عورتیں کھلیہان پر سونولی دھان کے بوجھوں کو دیکھ کر بیگن کا بھرتا ہو جائیں گی۔

مٹی کے برتن سے ٹپکتے ہوئے چھووا۔ گڑ کو انگلیوں سے چاٹتی ہوئی چمپیا آئی اور ماں کے طماچے کھا کر چیخ پڑی، 'مجھے کیوں مارتی ہے اے اے

سہوآئن جلدی سودانہیں دیتی کی نانی!
ایک سہوآئن کی ہی دوکان پر موتی جھرتے ہیں۔
جو جڑ گاڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ بول، گلے پر لات دے کر کلا تو توڑ دوں گی ہر جائی، جو پھر کبھی 'باجے نامرلیا' گاتے سنا! چال سیکھنے جاتی ہے ٹیشن کی چھوکریوں سے!'

برجو کی ماں نے چپ ہو کر اپنی آواز اندازی کہ اس کی بات جنگی کے جھوپڑے تک صاف صاف پہنچ گئی ہوگی۔

برجو گزری ہوئی باتوں کو بھول کر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور دھول جھاڑتے ہوئے برتن سے ٹپکتے گڑ کو للچائی نگاہ سے دیکھنے لگا تھا۔.....دیدی کے ساتھ وہ بھی دوکان جاتا تو دیدی اسے بھی گڑ چٹاتی، ضرور! وہ شکر قند کی لالچ میں رہا اور مانگنے پر ماں نے شکر قند کے بدلے۔

'اے میّا، ایک انگلی گڑ دے دے!' برجو نے تل ہتھی پھیلائی، 'دے نا میّا، ایک رتّی بھر!'

اے؟ سہوآئن جلدی سے سودانہیں دیتی ہے ایں ایں ایں ایں!'

سہوآئن جلدی سودانہیں دیتی کی نانی! ایک سہوآئن کی ہی دوکان پر موتی جھرتے ہیں۔ جو جڑ گاڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ بول، گلے پر لات دے کر کلا تو توڑ دوں گی ہر جائی، جو پھر کبھی 'باجے نامرلیا' گاتے سنا! چال سیکھنے جاتی ہے ٹیشن کی چھوکریوں سے!'

برجو کی ماں نے چپ ہو کر اپنی آواز اندازی کہ اس کی بات جنگی کے جھوپڑے تک صاف صاف پہنچ گئی ہوگی۔

برجو گزری ہوئی باتوں کو بھول کر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور دھول جھاڑتے ہوئے برتن سے ٹپکتے گڑ کو للچائی نگاہ سے دیکھنے لگا تھا۔.....دیدی کے ساتھ وہ بھی دوکان جاتا تو دیدی اسے بھی گڑ چٹاتی، ضرور! وہ شکر قند کی لالچ میں رہا اور مانگنے پر ماں نے شکر قند کے بدلے۔

'اے میّا، ایک انگلی گڑ دے دے!' برجو نے تل ہتھی پھیلائی، 'دے نا میّا، ایک رتّی بھر!'

'ایک رتّی کیوں، اٹھا کے برتن کو پھینک آتی ہوں پچھواڑے میں؛ جا کے چاٹنا! نہیں بنے گی میٹھی روٹی!.....میٹھی روٹی کھانے کا منھ ہوتا ہے!'

برجو کی ماں نے ابلے شکر قند کا سوپ روتی ہوئی چمپیا کے سامنے رکھتے ہوئے کہا،

'بیٹھ کے چھلکے اتار، نہیں تو ابھی.....'

دس سال کی چمپیا جانتی ہے، شکر قند رچھیلتے وقت کم از کم بارہ مرتبہ ماں اسے بال پکڑ کر جھک جھورے گی، چھوٹی چھوٹی کھوٹ نکال کر گالیاں دے گی۔ پاؤں پھیلا کے کیوں بیٹھی ہے اس طرح، بے لجّی! چمپیا ماں کے غصے کو جانتی ہے۔

برجو نے اس موقع پر تھوڑی سی خوشامد کر کے دیکھا، 'میّا' میں بھی بیٹھ کر شکر قند چھیلوں؟'

'نہیں!' ماں نے جھڑکی دی،

'ایک شکر قند چھی لے گا اور تین پیٹ میں! جا کے سدھو کی بہو سے کہو، ایک گھنٹے کیلئے کڑاہی مانگ کر لے گئی تو پھر لوٹانے کا نام ہی نہیں۔ جا جلدی!'

منھ لٹکا کر آنگن سے نکلتے نکلتے برجو نے شکر قند اور گڑ پر نگاہ دوڑائی۔ چمپیا نے اپنے جھبرے بالوں کی آڑ سے ماں کی اور دیکھا اور نظر بچا کر چپکے سے برجو کی جانب ایک شکر قند رپھینک دیا۔ برجو بھاگا۔

'سورج بھگوان ڈوب گئے۔ دیا باتی کی بیلا ہو گئی۔ ابھی تک گاڑی.....'

چمپیا بیچ میں ہی بول اٹھی۔

'کوئری ٹولے میں کسی نے گاڑی نہیں دی میّا! بپّا بولے، ماں سے کہنا سب ٹھیک ٹھاک کر کے تیار رہے۔ ملد ہیا ٹولی کے میاں جان کی گاڑی لانے جا رہا ہوں۔'

سنتے ہی برجو کی ماں کا چہرہ اتر گیا، لگا چھاتے کی کمانی اتر گئی گھوڑے سے اچانک۔ کوئری ٹولے میں کسی نے گاڑی منگنی نہیں دی! تب مل چکی گاڑی! جب اپنے گاؤں کے لوگوں کی آنکھ میں پانی نہیں تو ملد ہیا ٹولی کے میاں جان کی گاڑی کا کیا بھروسہ! نہ تین میں، نہ تیرہ میں! کیا ہوگا شکر قندر چھیل کر! رکھ دے اٹھا کے!..... یہ مرد ناچ دکھائے گا! بیل گاڑی پر چڑھ کر ناچ دکھانے لے جائے گا! چڑھ چکی بیل گاڑی پر، دیکھ چکی جی بھر ناچ!..... پیدل جانے والی سب پہنچ کر پرانی ہو چکی ہوں گی۔

برجو چھوٹی کڑاہی سر پر اوندھا کر واپس آیا، 'دیکھ دد یا، ملیٹری ٹوپی! اس پر دس لاٹھی مارنے سے بھی کچھ نہیں ہوگا۔'

چمپیا چپ چاپ بیٹھی رہی، کچھ بولی نہیں، زرا سی مسکرائی بھی نہیں۔ برجو نے وقت لیا میّا کا غصہ ابھی اترا نہیں ہے پوری طرح سے۔

مڑھیا کے اندر سے باگڑ کو باہر بھاگتی ہوئی برجو کی ماں بڑبڑائی، 'کل کی پنچ کوڑی کسائی کے حوالے کرتی ہوں راکس تجھے! ہر چیز میں منھ لگائے گا۔ چمپیا، باندھ دے بگڑا کو۔ کھول دے گلے کی گھنٹی۔ ہمیشہ ٹنر۔ ٹنر! مجھے ذرا نہیں سہاتا ہے!'

ٹنر۔ ٹنر سنتے ہی برجو کو سڑک سے جاتی ہوئی بیل گاڑیوں کی یاد ہو آئی۔ ابھی سہو آئن ٹولے کی گاڑیاں ناچ دیکھنے جا رہی تھیں۔ جھنر۔ جھنر بیلوں کی جھنکی، تم نے سو.....

'بیسی بک بک مت کرو!' باگڑ کے گلے میں جھنکی کھولتی بولی چمپیا۔ 'چمپیا، ڈال دے چولہے میں پانی! بپّا آویں تو کہنا کہ اپنے اڑن جہاز پر چڑھ کر ناچ دیکھ آئیں! مجھے ناچ دیکھنے کا سوکھ نہیں!..... مجھے جگائیو مت کوئی! میرا ماتھا دکھ رہا ہے۔'

مڑیا کے اوسارے پر برجو نے پھسپھسا کے پوچھا، 'کیوں کر دیا، ناچ میں اڑن جہاز بھی اڑے گا؟'

> اس میں جلنے کی کیا بات ہے بھلا! برجو کے بپّا نے تو پہلے ہی کر ماٹولی کے ایک ایک آدمی کو سمجھا کے کہا تھا، زندگی بھر مزدوری کرتے رہ جاؤ گے۔ سروے کا وقت آ رہا ہے۔ لاٹھی کڑی کرو دو چار بیگھے زمین حاصل کر سکتے ہو۔ سو گاؤں کی کسی پت کھوکی کا بھتار سروے کے وقت بابو صاحب کے خلاف کھانسا بھی نہیں..... برجو کے بپا کو کم سہنا پڑا ہے! بابو صاحب غصے میں سرکس ناچ کے باگھ/شیر کی طرح ہمڑتے رہ گئے۔ ان کا بڑا بیٹا گھر میں آگ لگانے کی دھمکی دے کر گیا..... آخر بابو صاحب نے اپنے سب سے چھوٹے لڑکے کو بھیجا۔ برجو کی ماں کو موسی کہہ کے پکارا۔ یہ زمین بابو جی نے میرے نام سے خریدی تھی۔ میری پڑھائی لکھائی اُسی زمین کی پیداوار سے چلتی ہے..... اور بھی کتنی باتیں۔ خوب موہنا جانتا ہے اُتار زرا سا لڑکا۔ زمیندار کا بیٹا ہے کہ.....'
>
> 'چمپیا، برجو سو گیا کیا؟ یہاں آ جا برجو، اندر تو بھی آ جا، چمپیا۔ بھلا آدمی آوے تو ایک بار آ جا!'

چٹائی پر کتھری اوڑھ کر بیٹھتی ہوئی چمپیا نے برجو کو چپ چاپ اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا، مفت میں مار کھائے گا بیچارا!

برجو نے بہن کی کتھری میں حصہ بانٹتے ہوئے چکی کمی لگائی۔ جاڑے کے وقت اس طرح گھٹنے پر ٹھڈی رکھ کر چکی کمی لگانا سیکھ چکا ہے وہ۔ اس نے چمپیا کے کان کے پاس منھ لے جا کر کہا،

'ہم لوگ ناچ دیکھنے نہیں جائیں گے؟ گاؤں میں ایک پرندہ بھی نہیں ہے۔ سب چلے گئے۔'

چمپیا کو اب تل بھر بھی بھروسہ نہیں۔ سنجھا/شام تارا ڈوب رہا ہے۔ بپا ابھی تک گاڑی لے کر نہیں لوٹے۔ ایک مہینہ پہلے سے ہی میا کہتی تھی، بلرامپور کے ناچ کے دن میٹھی روٹی بنے گی؛ چمپیا چھینٹ کی ساڑی پہنے گی، برجو پینٹ پہنے گا۔ بیل گاڑی پر چڑھ کر.....'

چمپیا کی بھیگی پلکوں پر ایک بوند آنسو آ گیا۔

برجو کا بھی دل بھر آیا۔ اس نے دل ہی دل املی پر رہنے والے جن بابا کو ایک بیگن کبولا، گاچھ کا سب سے پہلا بیگن، اس نے خود جس پودے کو لگایا ہے!..... جلدی سے گاڑی لیکر بپا کو بھیج دو، جن بابا!'

مڑھیا کے اندر برجو کی ماں چٹائی پر پڑی کروٹیں لے رہی تھی۔

'اوں ہوں، پہلے سے کسی بات کا منصوبہ نہیں باندھنا چاہئے کسی کو! بھگوان نے منصوبہ توڑ دیا۔ اس کو سب سے پہلے بھگوان سے پوچھنا ہے، یہ کس چوک کا پھل دے رہے ہو بھولا بابا! اپنے جانتے اس نے کسی دیوتا پتّر کی مان۔ منوتی باقی نہیں رکھی۔ سروے کے وقت زمین کیلئے جتنی منوتیاں تھیں..... ٹھیک ہی تو! مہاویر کا روٹ تو باقی ہی ہے۔ ہائے رے دیو!..... بھول چوک معاف کرو مہاویرا بابا! منوتی دونی کر کے چڑھائے گی برجو کی ماں!.....'

برجو کی ماں کے من میں رہ رہ کر جنگی کی پتو ہو کی باتیں چبھتی ہیں، بھک بھک بجلی بتی!..... چوری چماری کرنے والے کی بیٹی پتو ہو جلے گی نہیں! پانچ بیگھا زمین کیا حاصل کی ہے برجو کے بپا نے، گاؤں کے

کھوکیوں کی آنکھوں میں کرکری پڑ گئی ہے۔کھیت میں پاٹ لگا دیکھ کر گاؤں کے لوگوں کی چھاتی پھٹنے لگی، زمین پھوڑ کر پاٹ لگا یا ہے؛ بیشاکھی بادلوں کی طرح امڑتے آرہے ہیں پاٹ کے پودے! توالان توفلان! اتنی آنکھوں کی دھار بھلا فصل ہے! جہاں پندرہ من پاٹ ہونا چاہیئے، صرف دس من پاٹ کنٹا پر تول کے آنے او جن ہوا ربّی بھگت کے یہاں۔......

اس میں جلنے کی کیا بات ہے بھلا!...... برجو کے بپّانے تو پہلے ہی کرما ٹولی کے ایک ایک آدمی کو سمجھا کے کہا تھا، زندگی بھر مزدوری کرتے رہ جاؤ گے۔سروے کا وقت آرہا ہے۔لاٹھی کڑی کرو دو چار بیگھے زمین حاصل کر سکتے ہو۔سو گاؤں کی کسی پت کھوکی کا بھتار سروے کے وقت بابو صاحب کے خلاف کھانسا بھی نہیں...... برجو کے بپا کو کم سہنا پڑا ہے!

بابو صاحب غصے میں سرکس ناچ کے باگھ/شیر کی طرح ہمڑتے رہ گئے۔ ان کا بڑا بیٹا گھر میں آگ لگانے کی دھمکی دے کر گیا۔

آخر بابو صاحب نے اپنے سب سے چھوٹے لڑکے کو بھیجا۔ برجو کی ماں کو موسی کہہ کے پکارا۔ یہ زمین بابو جی نے میرے نام سے خریدی تھی۔ میری پڑھائی لکھائی اُسی زمین کی پیداوار سے چلتی ہے......اور بھی کتنی باتیں۔خوب موہنا جانتا ہے اُتنا ذرا سا لڑکا۔ زمیندار کا بیٹا ہے کہ......'

'چمپیا، برجو سو گیا کیا؟ یہاں آجا برجو، اندر۔ تو بھی آجا، چمپیا...... بھلا آدمی آوے تو ایک بار آج!'

برجو کے ساتھ چمپیا اندر چلی گئی۔

'ڈھبری بجھا دے...... بپا بلائیں تو جواب مت دینا۔کھپّچی گرا دے۔'

'بھلا آدمی رے، بھلا آدمی! منھ دیکھو ذرا اس مردکا!...... برجو کی ماں دن رات منجھا نہ دیتی رہتی تو لے چکے تھے زمین! روز آکر ماتھا پکڑ کے بیٹھ جائیں، مجھے زمین نہیں لینی ہے، برجو کی ماں، مجوری ہی اچھی۔ جواب دیتی تھی برجو کی ماں خوب سوچ سمجھ کے۔ چھوڑ دو، جب تمہارا کلیجا ہی تھر نہیں ہوتا ہے تو کیا ہوگا! جو روز مین جوڑ کے نہیں تو کسی اور رکے!......'

برجو کے باپ پر بہت تیزی سے غصہ چڑھتا ہے۔ بڑھتا ہی جاتا ہے۔...... برجو کی ماں کا نصیب

اس میں جلنے کی کیا بات ہے بھلا!...... برجو کے بپّانے تو پہلے ہی کرما ٹولی کے ایک ایک آدمی کو سمجھا کے کہا تھا، زندگی بھر مزدوری کرتے رہ جاؤ گے۔سروے کا وقت آرہا ہے۔لاٹھی کڑی کرو دو چار بیگھے زمین حاصل کر سکتے ہو۔سو گاؤں کی کسی پت کھوکی کا بھتار سروے کے وقت بابو صاحب کے خلاف کھانسا بھی نہیں...... برجو کے بپا کو کم سہنا پڑا ہے! بابو صاحب غصے میں سرکس ناچ کے باگھ/شیر کی طرح ہمڑتے رہ گئے۔ان کا بڑا بیٹا گھر میں آگ لگانے کی دھمکی دے کر گیا......

آخر بابو صاحب نے اپنے سب سے چھوٹے لڑکے کو بھیجا۔ برجو کی ماں کو موسی کہہ کے پکارا۔ یہ زمین بابو جی نے میرے نام سے خریدی تھی۔ میری پڑھائی لکھائی اُسی زمین کی پیداوار سے چلتی ہے...... اور بھی کتنی باتیں۔ خوب موہنا جانتا ہے اُتنا ذرا سا لڑکا۔ زمیندار کا بیٹا ہے کہ......'

ہی خراب ہے، جو ایسا گوبر گنیش گھر والا اسے ملا۔ کون سا سوکھ موج دیا ہے اس کے مرد نے! کولھو کے بیل کی طرح کھٹ کر ساری عمر کاٹ دی اس کے یہاں، کبھی ایک پیسے کی جلیبی بھی لا کر دی ہے اس کے کھسم نے! پاٹ کا دام بھگت کے یہاں لے کر باہر ہی باہر بیل ہٹا چلے گئے۔ برجو کی ماں کو ایک بار نمری لوٹ دیکھنے بھی نہیں دیا آنکھ سے۔بیل خرید لائے۔اسی دن سے گاؤں میں ڈھنڈورا پیٹنے لگے، برجو کی ماں اس بار بیل گاڑی پر چڑھ کر جائے گی ناچ دیکھنے! دوسرے کی گاڑی کے بھروسے ناچ دکھائے گا!......

آخر میں اسے اپنے آپ پر غصہ ہو آیا۔ وہ خود بھی کچھ کم نہیں! اس کی زبان میں آگ لگے! بیل گاڑی پر ناچ دیکھنے کی آرزو کس بے وقت میں اس کے منھ سے نکلی تھی، بھگوان جانے! پھر، آج صبح سے دوپہر تک، کسی نہ کسی بہانے اس نے اٹھارہ بار بیل گاڑی پر ناچ دیکھنے جانے کی گفتگو چھیڑی ہے۔

لو، خوب دیکھو ناچ! واہ رے ناچ! کتھری کے نیچے دوشالے کا سپنا!............

کل بھورے پانی بھرنے کیلئے جب جائے گی، پتلی زبان والی پتریا سب ہنستی آئیں گی، ہنستی جائیں گی......سبھی جلتے ہیں اس سے، ہائے بھگوان!......دو بچوں کی ماں ہو کر بھی وہ جس کی تس ہے۔ اس کا گھر والا اس کی بات میں رہتا ہے۔ وہ بالوں میں گری کا تیل ڈالتی ہے۔اُس کی اپنی زمین ہے۔ ہے کسی کے پاس ایک گھور زمین بھی اپنی اس گاؤں میں! جلیں گے، تین بیگھے میں دھان لگا ہوا ہے، اگہنی۔ لوگوں کی بکھ دیٹھ/ بری نظر سے بچے، تب تو!

باہر بیلوں کی گھنٹیاں سنائی پڑیں۔ تینوں ہوشیار ہو گئے۔ کان لگا کر سنتے رہے۔

'اپنے ہی بیلوں کی گھنٹی ہے، کیوں ری چمپیا؟' چمپیا اور برجو نے تقریباً ایک ہی ساتھ کہا،

'ہوں اوں اوں!'

'چپ!'

برجو کی ماں نے پھس پھسا کر کہا، 'شاید گاڑی بھی ہے! گھڑ گھڑاتی ہے نا؟'

'ہوں، اوں، اوں،!'

دونوں نے پھر ہنکار بھری۔

'چپ! گاڑی نہیں ہے۔ تو چپکے سے ٹٹی میں چھید/سوراخ کرکے دیکھ تو آ، چمپی! بھاگ کے آ، چپکے چپکے۔'

چمپیا بلی کی طرح ہولے ہولے پاؤں سے ٹٹی کے چھید سے جھانک آئی، 'ہاں، میا، گاڑی بھی ہے!'

برجو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کی ماں نے اسے ہاتھ پکڑ کر سلا دیا، 'بولے مت!'

چمپیا بھی گدڑی کے نیچے گھس گئی۔

باہر بیل گاڑی کھلنے کی آواز ہوئی۔ برجو کے باپ نے بیلوں کو زور سے ڈانٹا، 'ہاں ہاں! آ گئے گھر! گھر آنے کیلئے چھاتی پھٹی جاتی تھی۔!'

برجو کی ماں تاڑ گئی، ضرور ملد ہیا ٹولی میں گانجے کی چلم چڑھ رہی تھی، آواز تو بڑی کھنکھناتی ہوئی نکل رہی ہے۔

'چمپیا ہا!' باہر سے ہی پکار کر کہا اس کے باپ نے، 'بیلوں کو گھاس دے دے، چمپیا ہا!'

اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ چمپیا کے باپ نے آنگن میں آکر دیکھا تو نہ روشنی، نا چراغ، ناچولہے میں آگ۔..... بات کیا ہے! ناچ دیکھنے، اُتاولی ہوکر، پیدل ہی چلی گئی کیا.....!

برجو کے گلے میں کھسکھساہٹ ہوئی اور اس نے روکنے کی پوری کوشش بھی کی، لیکن کھانسی جب شروع ہوئی تو پورے پانچ منٹ تک وہ کھانستا رہا۔

'برجو! بیٹا برج موہن!

'برجو کے باپ نے پچکار کر بلایا، 'میا غصے کے مارے سوگئی کیا؟..... ارے، ابھی تو لوگ جا ہی رہے ہیں۔'

برجو کی ماں کے من میں آیا کہ کس کر جواب دے، نہیں دیکھنا ہے ناچ..... لوٹا دو گاڑی!

چمپیا۔ ہا! اٹھتی کیوں نہیں؟ لے، دھان کی پنج سیس رکھ دے۔ دھان کی بالیوں کا چھوٹا جھبّا جھوپڑے کے اسارے پر رکھ کر اس نے کہا،

'دیا بالو!' برجو کی ماں اٹھ کر اسارے پر آئی،

'ڈیڑھ پہر رات کو گاڑی لانے کی کیا ضرورت تھی؟ ناچ تو اب ختم ہو رہا ہوگا۔'

ڈھبری کی روشنی میں دھان کی بالیوں کا رنگ

> باہر بیل گاڑی کھلنے کی آواز ہوئی۔ برجو کے باپ نے بیلوں کو زور سے ڈانٹا، 'ہاں ہاں! آ گئے گھر! گھر آنے کیلئے چھاتی پھٹی جاتی تھی۔!'
>
> برجو کی ماں تاڑ گئی، ضرور ملد ہیا ٹولی میں گانجے کی چلم چڑھ رہی تھی، آواز تو بڑی کھنکھناتی ہوئی نکل رہی ہے۔
>
> 'چمپیا ہا!' باہر سے ہی پکار کر کہا اس کے باپ نے، 'بیلوں کو گھاس دے دے، چمپیا ہا!'
>
> اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ چمپیا کے باپ نے آنگن میں آکر دیکھا تو نہ روشنی، نا چراغ، ناچولہے میں آگ۔..... بات کیا ہے! ناچ دیکھنے، اُتاولی ہوکر، پیدل ہی چلی گئی کیا.....!
>
> برجو کے گلے میں کھسکھساہٹ ہوئی اور اس نے روکنے کی پوری کوشش بھی کی، لیکن کھانسی جب شروع ہوئی تو پورے پانچ منٹ تک وہ کھانستا رہا۔
>
> 'برجو! بیٹا برج موہن!' برجو کے باپ نے پچکار کر بلایا، 'میا غصے کے مارے سوگئی کیا؟..... ارے، ابھی تو لوگ جا ہی رہے ہیں۔'

دیکھتے ہی برجو کی ماں کے من کا سب میل دور ہو گیا..... دھانی رنگ اس کی آنکھوں سے اتر کر روم روم میں گھل گیا۔

ناچ ابھی شروع بھی نہیں ہوا ہوگا۔ ابھی ابھی بلرامپور کے بابو کی کمپنی گاڑی موہن پور ہوٹل بنگلا سے حاکم صاحب کو لانے گئی ہے۔ اس سال آخری ناچ ہے۔ پنچ سیس ٹٹی میں کھونس دے، اپنے کھیت کا ہے۔'

'اپنے کھیت کا؟'

ہلستی ہوئی برجو کی ماں نے پوچھا،

'پک گئے دھان؟'

'نہیں دس دن میں اگہن چڑھتے چڑھتے لال ہوکر جھک جائیں گی سارے کھیت کی بالیاں۔ ملد ہیا لوٹی جا رہا تھا، اپنے کھیت میں دھان دیکھ کر آنکھیں جڑا گئیں۔ سچ کہتا ہوں، پنچ سیس توڑتے وقت انگلیاں کانپ رہی تھیں میری!'

برجو نے دھان کی ایک بالی سے ایک دھان لیکر منھ میں ڈال لیا اور اس کی ماں نے ایک ہلکی ڈانٹ دی،

'کیسا لگڑ ہے تو رے!..... ان دشمنوں کے مارے کوئی نیم دھرم جوبچے!'

'کیا ہوا، ڈانٹتی کیوں ہے؟'

نو ان کے پہلے ہی نیا دھان جٹھا دیا، دیکھتے نہیں؟'

'ارے، ان لوگوں کا سب کچھ معاف ہے۔ چرئی چن من ہیں یہ لوگ!، بس ہم دونوں کے منھ میں نو ان کے پہلے نیا اناج نا پڑے۔'

اس کے بعد چمپیا نے بھی دھان کی بالی سے دو دھان لے کر دانتوں تلے دبایا،

'اومیّا! اتنا میٹھا چاول!'

'اور گمکتا بھی ہے نا دیا؟'

برجو نے پھر منھ میں دھان لیا۔

روٹی پوٹی تیار کر چکی کیا؟'

برجو کے باپ نے مسکرا کر پوچھا۔

'نہیں!'

مان بھرے سر میں بولی برجو کی ماں، 'جانے کا ٹھیک ٹھکانا نہیں..... اور روٹی بنتی ہے!'

واہ! خوب ہو تم لوگ!..... جس کے پاس بیل

ہیں اسے گاڑی منگنی نہیں ملے گی بھلا؟ گاڑی والوں کو بھی بیل کی کبھی ضرورت ہوگی۔...... پوچھوں گا تب کو بڑی ٹولا والوں سے !...... لے، جلدی سے روٹی بنالے۔'

'دیر نہیں ہوگی؟'

'ارے، ٹوکری بھر روٹی تو تو پلک مارتے بنا لیتی ہے؛ پانچ روٹیاں بننے میں کتنی دیر لگے گی۔!'

اب برجو کی ماں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھل کر کھیلنے لگی۔ اس نے نظر بچا کر دیکھا، برجو کا بپّا اس کی طرف ایک ٹک نہار رہا ہے۔...... چمپیا اور برجو نا ہوتے تو من کی بات ہنس کر کھولتے دیر نا لگتی۔ چمپیا اور برجو نے ایک دوسرے کو دیکھا اور خوشی سے ان کے چہرے جگمگا اٹھے۔ ......میا بیکار غصہ ہو رہی تھی نا!

'چمپی! ذرا گھیلسار میں کھڑی ہو کر مکھنی پھووا کو آواز دے تو!'

'اے پھوآ آ! سنتی ہو پھووا میّا بلا رہی ہے!'

پھولوں نے کوئی جواب سیدھے نہیں دیا، مگر اس کی بڑبڑاہٹ صاف سنائی پڑی،

'ہاں' اب پھووا کو کیوں گہارتی ہے؟ سارے ٹولے میں بس ایک پھووا ہی تو بغیر ناتھ پگہیا والی ہے۔'

'اری پھووا!' برجو کی ماں نے ہنس کر جواب دیا، 'اس وقت برا مان گئی تھیں کیا؟ ناتھ پگہیا والے کو آکر دیکھو، دوپہر رات میں گاڑی لے کر آیا ہے! آجاؤ پھووا، میں میٹھی روٹی پکانا نہیں جانتی۔'

پھووا کانکھتی۔ کھانستی آئی، 'اسی سے گھڑی پہر دن رہتے ہی پوچھ رہی تھی کہ ناچ دیکھنے جائے گی کیا؟ کہتی، تو میں پہلے سے ہی اپنی انگیٹھی یہاں سلگا جاتی۔'

برجو کی ماں نے پھووا کو انگیٹھی دکھلا دی اور کہا، 'گھر میں اناج دانا بغیرہ تو کچھ ہے نہیں۔ ایک باگڑ ہے اور کچھ برتن باسن۔ سورات بھر کے لئے یہاں تمبا کو رکھ جاتی ہیں۔ اپنا حقہ لے آئی ہونا پھووا؟'

پھووا کو تمبا کو مل جائے، تو رات بھر کیا، پانچ رات بیٹھ کر جاگ سکتی ہے۔ پھووا نے اندھیرے میں ٹٹول کر تمبا کو کا انداز کیا۔.....'اوہو! ہاتھ کھول کر تمبا کو

برجو کی ماں نے پھووا کو انگیٹھی دکھلا دی اور کہا، 'گھر میں اناج دانا بغیرہ تو کچھ ہے نہیں۔ ایک باگڑ ہے اور کچھ برتن باسن۔ سورات بھر کے لئے یہاں تمبا کو رکھ جاتی ہیں۔ اپنا حقہ لے آئی ہونا پھووا؟'
پھووا کو تمبا کو مل جائے، تو رات بھر کیا، پانچ رات بیٹھ کر جاگ سکتی ہے۔ پھووا نے اندھیرے میں ٹٹول کر تمبا کو کا انداز کیا۔.....'اوہو! ہاتھ کھول کر تمبا کو رکھا ہے برجو کی ماں نے! اور ایک وہ ہے ساہو آئین! ارام کہو! اس رات کو افیم/افیون کی گولی کی طرح ایک مٹر بھر تمبا کو رکھ کر چلی گئی گلاب باغ میلے اور کہہ گئی کہ ڈبی بھر تمبا کو ہے۔'
برجو کی ماں چولہا سلگانے لگی۔ چمپیا نے شکر قند کو مسل کر گولے بنائے اور برجو سر پر کڑاہی اوندھا کر اپنے آپ کو دکھلانے لگا، 'ملیٹری کی ٹوپی! اس پر دس لاٹھی مارنے سے بھی کچھ نہیں ہوگا!'

رکھا ہے برجو کی ماں نے! اور ایک وہ ہے ساہو آئین! ارام کہو! اس رات کو افیم/افیون کی گولی کی طرح ایک مٹر بھر تمبا کو رکھ کر چلی گئی گلاب باغ میلے اور کہہ گئی کہ ڈبی بھر تمبا کو ہے۔'

برجو کی ماں چولہا سلگانے لگی۔ چمپیا نے شکر قند کو مسل کر گولے بنائے اور برجو سر پر کڑاہی اوندھا کر اپنے آپ کو دکھلانے لگا،

'ملیٹری کی ٹوپی! اس پر دس لاٹھی مارنے سے بھی کچھ نہیں ہوگا!'

سبھی ٹھٹھا کر ہنس پڑے۔ برجو کی ماں ہنس کر بولی،' تاخے پر تین چار موٹے شکر قند ہیں، دے دے برجو کو چمپیا، بیچارا شام سے ہی.....'

بیچارا مت کہو میّا، خوب سچارا ہے!' اب چمپیا چہکنے لگی، 'تم کیا جانو، کتھری کے نیچے منہ کیوں چل رہا تھا بابو صاحب کا!'

'ہی ہی ہی!'

برجو کے ٹوٹے دودھ کے دانتوں کی پھانک سے بولی نکلی، 'بلیک-مارٹن میں پانچ شکر قند کھا لیا! ہا۔ہا۔ہا!'

سبھی ٹھٹھا کر ہنس پڑے۔ برجو کی ماں نے پھووا کا دل رکھنے کیلئے پوچھا،

'ایک کنواں گڑ ہے۔ آدھا ڈال دوں پھووا؟'

پھووا نے گدگد ہو کر کہا،

'اری شکر قند تو خود میٹھا ہوتا ہے، اتنا کیوں ڈالے گی!'

جب تک دونوں بیل دانا گھاس کھا کر ایک دوسرے کے جسم کو زبان سے چاٹیں، برجو کی ماں تیار ہوگئی۔ چمپیا نے چھینٹ کی ساڑی پہنی اور برجو بٹن کی کمی میں پینٹ پر پٹسن کی ڈوری بندھوانے لگا۔

برجو کی ماں نے آنگن سے نکل گاؤں کی اور کان لگا کر سننے کی کوشش کی، 'اوں ہوں، اتنی دیر تک بھلا پیدل جانے والے رکے رہیں گے!'

پورنیا کا چاند سر پر آگیا ہے۔...... برجو کی ماں نے اصلی روپا کا منگ ٹیکا پہنا ہے آج، پہلی بار۔ برجو کے بپا کو ہو کیا گیا ہے، گاڑی جوتتا کیوں نہیں، منہ کی اور ایک ٹک دیکھ رہا ہے، مانو ناچ کی لال پان کی......

گاڑی پر بیٹھتے ہی برجو کی ماں کے جسم میں ایک عجیب گدگدی لگنے لگی۔ اس نے بانس کی بلی کو پکڑ

کر کہا، 'گاڑی پر ابھی بہت جگہ ہے۔.....ذرا داہنی سڑک سے ہانکنا۔'

بیل جب دوڑنے لگے اور پہیہ جب چوں چوں کر کے گھر گھرانے لگا تو برجو سے نہیں رہا گیا، 'اڑن جہاز کی طرح اڑاؤ بپا!'

گاڑی جنگی کے پچھواڑے پہنچی۔ برجو کی ماں نے کہا، ذرا جنگی سے پوچھو نا، اس کی پتوہو ناچ دیکھنے چلی گئی کیا۔'

گاڑی رکتے ہی جنگی کے جھونپڑے سے آتی ہوئی رونے کی آواز صاف ہوگئی۔ برجو کے بپا نے پوچھا، 'ارے جنگی بھائی، کاہے کنّا روہٹ ہو رہا ہے آنگن میں؟'

جنگی گھور تاپ رہا تھ، بولا، کیا پوچھتے ہو، رنگی بلرامپور سے لوٹا نہیں، پتوہیہ ناچ دیکھنے کیسے جائے! آسرا دد یکھتے دیکھتے اُدھر گاؤں کی سبھی عورتیں چلی گئیں۔

'اری ٹیشن والی، تو روتی ہے کاہے!' برجو کی ماں نے پکار کر کہا، آ آ جھٹ سے کپڑا پہن کر۔ ساری گاڑی پڑی ہوئی ہے! بیچاری!.....آ جا جلدی!'

بغل کے جھونپڑے سے رادھے کی بیٹی سنری نے کہا، 'کا کی، گاڑی میں جگہ ہے؟ میں بھی جاؤں گی۔'

بانس کی جھاڑی کے اس پار لرینا خواس کا گھر ہے۔ اس کی بہو بھی نہیں گئی ہے۔ گلٹ کا جھنکی کڑا پہن کر جھمکتی آ رہی ہے۔

'آ آ! جو باقی رہ گئی ہیں، سب آ جائیں جلدی!'

جنگی کی پتوہو، لرینا کی بیوی اور رادھے کی بیٹی سنری، تینوں گاڑی کے پاس آ گئیں۔ بیل نے پچھلا پیر پھینکا۔ برجو کے باپ نے ایک بھدی گالی دی، 'سالا! تاڑ مار کر لنگڑی بنائے گا پتوہو کو!'

سبھی ٹھٹھا کر ہنس پڑے۔ برجو کے باپ نے گھونگھٹ میں جھکی دونوں پتوہوں کو دیکھا۔ اسے اپنے کھیت کی جھکی ہوئی بالیوں کی یاد آ گئی!

جنگی کی پتوہو کا گونا تین ہی ماہ پہلے ہوا ہے۔ گونے کی رنگین ساڑی سے کڑوے تیل اور لٹھوا سندور کی خوشبو آ رہی ہے۔ برجو کی ماں کو اپنے گونے کی یاد آئی۔ اس نے کپڑے کی گٹھری سے تین میٹھی روٹیاں نکال کر کہا، 'کھالے ایک ایک کر۔ سمراہا کے سرکاری کوپ/کوئیں میں پانی پی لینا۔'

گاڑی گاؤں سے باہر ہو کر دھان کے کھیتوں کے بغل سے جانے لگی۔ چاندنی، کا تک کی!.....کھیتوں میں دھان کے جھرتے پھولوں کی گندھ آتی ہے۔

بانس کی جھاڑی میں کہیں دودھی کی لتا پھولی ہے۔ جنگی کی پتوہو نے ایک بیڑی سلگا کر برجو کی ماں کی جانب بڑھائی۔ برجو کی ماں کو اچانک یاد آئی، چمپیا، سنہری، لرینا کی بیوی اور جنگی کی پتوہو، یہ چاروں ہی تو گاؤں میں بیس کوپ کا گیت گانا جانتی ہیں۔.....خوب!'

گاڑی کی لیک دھن کھیتوں کے درمیان ہو کر گئی ہے۔ چاروں اور گونے کی ساڑی کی کھسکھساہٹ جیسی آواز ہوتی ہے۔.....برجو کی ماں کے ماتھے کے منگ ٹکّے پر چاندنی چھٹکتی ہے۔

'اچھا، اب ایک بیس کوپ کا گیت گا تو چمپیا.....ڈرتی ہے کاہے؟ جہاں بھول جاؤ گی، بغل میں تو ماسٹرنی بیٹھی ہی ہے!'

گاڑی گاؤں سے باہر ہو کر دھان کے کھیتوں کے بغل سے جانے لگی۔ چاندنی، کا تک کی! کھیتوں میں دھان کے جھرتے پھولوں کی گندھ آتی ہے۔ بانس کی جھاڑی میں کہیں دودھی کی لتا پھولی ہے۔ جنگی کی پتوہو نے ایک بیڑی سلگا کر برجو کی ماں کی جانب بڑھائی۔ برجو کی ماں کو اچانک یاد آئی، چمپیا، سنہری، لرینا کی بیوی اور جنگی کی پتوہو، یہ چاروں ہی تو گاؤں میں بیس کوپ کا گیت گانا جانتی ہیں۔ خوب!

گاڑی کی لیک دھن کھیتوں کے درمیان ہو کر گئی ہے۔ چاروں اور گونے کی ساڑی کی کھسکھساہٹ جیسی آواز ہوتی ہے۔ برجو کی ماں کے ماتھے کے منگ ٹکّے پر چاندنی چھٹکتی ہے۔

'اچھا، اب ایک بیس کوپ کا گیت گا تو چمپیا۔ ڈرتی ہے کاہے؟ جہاں بھول جاؤ گی، بغل میں تو ماسٹرنی بیٹھی ہی ہے!'

دونوں پتوہوؤں نے تو نہیں، مگر چمپیا اور سنری نے کھکھا سکر گلا صاف کیا۔

برجو کے باپ نے بیلوں کو للکارا، 'چل بھیا! اور ذرا زور سے! گارے چمپیا، نہیں تو میں بیلوں کو دھیرے دھیرے چلنے کو کہوں گا!'

جنگی کی پتوہو نے چمپیا کے کان کے پاس گھونگھٹ لے جا کر کچھ کہا اور چمپیا نے دھیمے سے شروع کیا، 'چندا کی چاندنی.....'

برجو کو گود میں لے کر بیٹھی اس کی ماں کی خواہش ہوئی کہ وہ بھی ساتھ ساتھ گیت گائے۔ برجو کی ماں نے جنگی کی پتوہو کی اور دیکھا، دھیرے دھیرے گنگنا رہی ہے وہ بھی۔ کتنی پیاری پتوہو ہے! گونے کی ساڑی سے ایک خاص قسم کی گندھ نکلتی ہے۔ ٹھیک ہی تو کہا ہے اس نے! برجو کی ماں بیگم ہے، لال پان کی بیگم یہ تو کوئی بری بات نہیں۔ ہاں وہ سچ مچ لال پان کی بیگم ہے!

برجو کی ماں نے اپنی ناک پر دونوں آنکھوں کو مرکوز کرنے کی کوشش کر کے اپنے حسن کی جھانکی لی، لال ساڑی کی جھل مل کناری، منگ ٹکّا پر چاند برجو کی ماں کے من میں اب اور کوئی تمنا نہیں۔ اسے نیند آ رہی ہے!

❑❑❑

غزل

یوں نہ دکھلاؤ اک جھلک جانی
اب نہیں دل میں وہ للک جانی

نہ ملے تم ہزار بار ہو تُف
بے بسی بھی کہاں تلک جانی

تری پلکوں پہ اشک ہیں لرزاں
کبھی دیکھی نہیں لچک جانی

باب دشنامیان وا بھی کرو
یہ تکلف کہاں تلک جانی

بے دماغی کا راج ہے برپا
بددماغی پہ کوئی شک جانی

ہے دریدہ قبائے روح بھی جب
دل نہ ملنے پہ کیا کسک جانی

ایک چہرے میں کتنے چہرے ہیں
بے حجابی میں کیا ہے زک جانی

علی اصغر حیدری عازی
جھیلم ہاسٹل، روم نمبر ۲۰۶، جے این یو، نئی دہلی
موبائل: 9968616032

غزل

ساحلوں کی دوریوں کے درمیاں
موجِ دریا کشتیوں کے درمیاں

ریت کے انبار پر لکھا ہوا
نام اس کا سرخیوں کے درمیاں

کس نے پیغام محبت لکھ دیا
زندگی کے حاشیوں کے درمیاں

دوسروں کے عیب پر رکھ کر نظر
دیکھتا ہے خامیوں کے درمیاں

دیکھنا تو سیکھ لے کچھ اس طرح
زندگی کو خوبیوں کے درمیاں

کھو رہے ہیں ملک کی تہذیب کو
ہے لڑائی کرسیوں کے درمیاں

پرکشش منظر ہے نکہتؔ دیکھنا
تاج کی انگنائیوں کے درمیاں

نسرین نکہتؔ
راؤرکیلا، اڑیسہ
موبائل: 9795555093

حمید دلوائی
۱۹۳۲ ۱۹۷۷

ایندھن

میں اسٹیٹ ٹرانسپورٹ کی بس سے بازار میں اترا اور قصبے کی طرف چلنے لگا

سورج کو بادلوں نے یوں ڈھانپ رکھا تھا جیسے دیئے کے کانچ پر مکڑیوں کے جالے لٹکے ہوں۔ راستہ ٹیڑھا میڑھا اور چڑھائی والا تھا جس کے بعد گہری ڈھلان تھی۔ سڑک کے کنارے پر مہندی کی جھاڑیاں تھیں جنکے پتوں پر بارش کی بوندیں اب تک ٹکی ہوئی مسلسل چمک رہی تھیں۔ راستے کے دونوں طرف اُگے ہوئے دھان کے کھیتوں میں جھولتے زرد خوشوں کے سر جھکے ہوئے تھے۔ دن ڈوبنے سے پہلے ہی اندھیرا چھا گیا تھا اور لوگ بازار سے قصبے کی طرف یوں لپک رہے تھے جیسے کوئی وحشی بیل رسی تڑا کر حملہ آور ہو رہا ہو۔

مجھے ان میں سے کوئی نہیں پہچانتا تھا۔ میں بھی ان کو نہیں پہچانتا تھا مگر اس علاقے سے واقف تھا۔ بازار کی سڑکیں اب تارکول کی بن چکی تھیں لیکن آگے کی سڑک کی پرانی شان اب بھی برقرار تھی۔ کچھ جھونپڑیوں جیسے مکانوں کی چھتیں اب منگلوری کھپریلوں سے ڈھک چکی تھیں لیکن ان کے گرد لگی ہوئی کانٹے دار باڑھ اب بھی پرانی وضع پر قائم تھی۔ راستے میں پڑنے والے ہمارے قصبے کے قبرستان میں پیر کی نئی تربت ابھری دکھائی دے رہی تھی۔ پچھلے دس برسوں میں قبرستان میں کتنی ہی قبریں کھودی گئی ہوں گی۔ قبرستان بھر جانے کی وجہ سے قصبے والے دوسری جگہ کی تلاش میں ہیں، میں نے بمبئی میں سنا تھا؛ لیکن یہ اب تک استعمال میں تھا۔ بارش سے وہاں گھٹنوں تک اونچی گھاس ہر طرف پھیل گئی تھی اور دو تین بھینسیں پونچھ ہلاتی ہوئی چر رہی تھیں۔

مجھے چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ میرا بیگ زیادہ وزنی نہیں تھا، پھر بھی اسے سنبھالنا بوجھ لگ رہا تھا۔ ساری جان درد کے مارے چھاتی میں جمع ہوگئی تھی۔ ہر قدم لگتا تھا دل کی دھڑکن کے ساتھ لڑکھڑا رہا ہے۔ یہ احساس کہ اب اپنے کمزور دل کو مسلسل سنبھالنا پڑے گا، میرے ذہن کو کچوکے لگا رہا تھا اور اب پندرہ برس کے بعد اس مرض سے نمٹنے کے لئے آرام کرنے کی غرض سے میں قصبے کو لوٹ رہا تھا۔

سڑک کی تیکھی چڑھائی کر اوپر پہنچا تو مجھے اپنا دم نکلتا محسوس ہوا۔ میں ہانپتا ہوا کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ آگے سڑک بل کھا کر نیچے اتر رہی تھی۔ وہیں آگے پہاڑی کی ڈھلان پر ایک کے اوپر ایک بنے ہوئے قصبے کے مکان دکھائی دینے لگے تھے۔ پہاڑی کے قدموں کو چاٹ کر سڑک سانپ کی طرح لہرا کر غائب ہوگئی تھی اور داہنے ہاتھ پر وا ششٹھی ندی کا، دھنک کی کمان جیسا خم دار، لبالب بھرا ہوا پاٹ پھیلا تھا۔ اسے روک کر کمان کا خم دینے والی پچھّم کے پہاڑوں پر سے آنے والی ہوا اب میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھی۔ میں ڈھلان اتر کر آگے چل پڑا۔

دھیرے دھیرے اندھیرا چھانے لگا اور میرے گھر پہنچتے پہنچتے بالکل اندھیرا ہو گیا۔ سڑک پار کر کے میں قصبے کی گلی میں داخل ہوا اور اینٹوں کے

حامد عمر دلوائی مراٹھی زبان کے مقبول ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے مراٹھی زبان میں کئی ناول لکھے۔ مراٹھی کے علاوہ ان کی انگریزی میں بھی کچھ کتابوں شائع ہو چکی ہیں۔ مراٹھی اور انگریزی زبان پر انہیں یکساں مہارت حاصل تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے تہذیبی اور سماجی مسائل پر مبنی ان کی کئی کتابیں مراٹھی زبان میں شائع ہو چکی ہیں۔ انہوں نے بحیثیت صحافی اپنے کیریئر کی شروعات کی تھی۔ وہ سیاست میں بھی سرگرم رہے۔ انڈین سوشلسٹ پارٹی کے نمایاں لیڈر کے طور پر بھی انہوں نے اپنی شناخت قائم کی۔ اپنی محض ۴۴ سالہ زندگی کا کافی بڑا عرصہ انہوں نے مسلم طبقہ بالخصوص مسلم عورتوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے میں صرف کیا۔

اردو کے ادبی رسالوں میں عام طور پر روسی، انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں کی تصنیفات نظر آجاتی ہیں لیکن اردو ہندی کے علاوہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادب کے تراجم شائع کرنے کا رواج ذرا کم ہے۔ ہماری کوشش رہے گی کہ 'نیا دور' کے ہر شمارے میں ہندوستانی زبانوں کے نمائندہ ادب پاروں کے ترجمے پیش کئے جائیں۔ اسی سلسلہ کی پہلی کڑی کے طور پر مراٹھی زبان کے مشہور ادیب حمید دلوائی کے ناول 'ایندھن' کی پہلی قسط شائع کی جارہی ہے۔

(ایڈیٹر)

بنے راستے پر چڑھ کر گھر پہنچ گیا۔

گھر کا صدر دروازہ بند تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

کون ہے؟ اندر سے والد کی آواز سنائی دی۔

دروازہ کھلا ہے۔

میں نے دروازے کو ڈھکیلا۔ دالان میں پڑی آرام کرسی پر ان کا دبلا بدن پڑا ہوا تھا۔ اندھیرے میں صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے سیڑھی چڑھ کر اندر قدم رکھا۔ لگتا تھا دالان کے فرش کی بہت دنوں سے پتائی نہیں ہوئی تھی۔ یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ گھر کی جھاڑ پونچھ بھی اب کوئی پہلے کی طرح مستعدی سے نہیں کرتا۔ فرش پر ہر طرف پیڑیاں سی بکھری ہوئی تھیں۔ وہیں بابا کی پی ہوئی بیڑیوں کے ٹوٹے بھی پھیلے ہوئے تھے۔

میری موجودگی کو محسوس کر کے انہوں نے گردن میری طرف گھمائی۔ اس اندھیرے میں مجھے پہچاننے کے لئے انہوں نے اپنی آنکھیں بار بار جھپکیں، پھر دونوں ہاتھوں کا چھجا بنا کر غور سے میری طرف دیکھا۔ پھر بھی وہ مجھے پہچان نہ سکے۔

کون ہے؟ انہوں نے پوچھا

میں!

تب انہوں نے مجھے پہچانا۔ شاید انہیں میری آواز سے پتہ چلا ہوگا۔ انہوں نے پوچھا، پھر بڑبڑا کر خود سے بولے، لگتا ہے آ گیا ہوگا پھر میری طرف مخاطب ہو کر زور سے پوچھا، ''آ گئے؟''

میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ اچانک خاموش ہو گئے۔ مجھے گمان ہوا کہ ان کی آنکھیں بھر آئی ہیں۔ آنسو کچھ دیر ان کے جھریوں بھرے گالوں پر بہتے رہے۔ میں نے سوچا ان کا غبار نکل جائے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے اپنی لنگی کے کنارے سے چہرہ پونچھا۔ پھر پوچھا:

کب نکلے تھے؟

صبح ایس ٹی سے۔

طبیعت کیسی ہے اب؟

ٹھیک ہے۔

دل کی بیماری ہے؟

ہاں۔ مگر فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے آرام کرنے کو کہا ہے۔

اچھا۔ اب آ گئے ہو تو آرام کرنا۔

ہاں۔

وہ پھر چند لمحے ساکت رہے۔ پھر بولے، جاؤ، اندر جاؤ بھابی کھانا پکا رہی ہیں۔ نہا دھولو، کھانا کھا کر

> بھائی بہت ڈھل گیا تھا لیکن وہ پہلی جیسی ہی دکھائی دیتی تھی اور میں اسے اتنے برسوں بعد دیکھ رہا تھا۔ یہ پندرہ برس بھائی کو رگیدتے ہوئے ہوئے گزرے تھے، لیکن بھابی کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے یہ وقت گزرا ہی نہ ہو۔ وہ شادی کے بعد گھر میں آئی ہی تھی کہ میں نے گھر چھوڑا۔ اس دوران میں گھر نہ آیا اور وہ بہت سے نشیب و فراز جھیل کر اس گھر کا حصہ بن گئی تھی۔ اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس کے باوجود اس نے اپنے برتاؤ کو کسی کمی یا دکھ سے آلودہ نہیں ہونے دیا تھا۔

آرام کرو۔ آنے کی چھٹی کیوں نہیں لکھی؟

اچانک طے کیا۔

مگر تار تو کر سکتے تھے۔ بھائی تمہیں لینے بازار نہ آتا۔

میں کچھ نہ بولا۔ میں خود ہی اپنے آنے کا ڈھول نہیں پیٹنا چاہتا تھا۔ اب پندرہ برس بعد اپنی واپسی کا اعلان کرتے ہوئے مجھے ڈر لگ رہا تھا۔

اچھا، اب جاؤ۔

میں اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا گھر میں گیا۔ باورچی خانے میں مٹی کے تیل کے چراغ کی ٹمٹماتی روشنی میں بھابی کھانا پکانے میں جُٹی ہوئی تھی۔ میں اس کے اوپر کے دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ بھابی چونک کر کچھ دیر مجھے پہچانے بغیر تکتی رہی، پھر ایک دم اٹھ کر میرے پاس آ گئی۔

تم کب آئے؟ اس نے تعجب سے پوچھا۔

ابھی۔

اسے جیسے یقین نہ آیا۔ اور بتایا بھی نہیں؟ بیگ یہاں تک خود اٹھا کر لائے؟ تمہیں لینے کوئی نہ آتا کیا؟

ارے، مگر میرا آنے کا ارادہ ہی کب تھا۔

وہ تو مجھے پتہ ہے۔ پندرہ برس بعد آنے کو جی چاہا۔ یہی ہماری خوش نصیبی ہے۔ اپنے شوہر کو مخاطب کر کے اونچی آواز میں بولی، اجی، دیکھو کون آیا ہے۔

بھائی پچھلے دروازے میں ٹانگیں باہر لٹکائے بیٹھا تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پھر اٹھ کر اندر آیا۔ اس کا بدن گھلتا ہوا لگ رہا تھا۔ گزرے ہوئے پندرہ برسوں کے زخموں کے نشان اس کے پورے بدن پر محسوس ہوتے تھے۔ وہ عید کے دن کی طرح مجھے گلے لگا کر ملا۔ پھر الگ ہو کر اسی جگہ جا بیٹھا۔

لگتا نہیں تھا اب تم آؤ گے، بھابی پھر چولہے کے پاس جا کر روٹی تھاپتے ہوئے بولی۔

مگر کیوں؟ میں نے احمقوں کی طرح پوچھا۔

لگتا کیسے؟ پندرہ برس میں کتنی بار آئے ہو؟

پندرہ برس میں کبھی بیمار نہیں ہوا۔

طبیعت کا کیا حال کر لیا ہے۔

میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ پھر کچھ دیر بعد پوچھا، تمہاری طبیعت کیسی ہے؟

کیسی دکھتی ہے؟

بھائی بہت ڈھل گیا تھا لیکن وہ پہلی جیسی ہی دکھائی دیتی تھی اور میں اسے اتنے برسوں بعد دیکھ رہا تھا۔ یہ پندرہ برس بھائی کو رگیدتے ہوئے ہوئے

گزرے تھے، لیکن بھابی کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے یہ وقت گزر ا ہی نہ ہو۔ وہ شادی کے بعد گھر میں آئی ہی تھی کہ میں نے گھر چھوڑا۔ اس دوران میں گھر نہ آیا اور وہ بہت سے نشیب و فراز جھیل کر اس گھر کا حصہ بن گئی تھی۔ اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس کے باوجود اس نے اپنے برتاؤ کو کسی کمی یا دکھ سے آلودہ نہیں ہونے دیا تھا۔

اولاد نہ ہونے کی وجہ سے ایک بار بازار کے ڈاکٹر نے بھائی کو بمبئی میں اسپیشلسٹ کو دکھانے کا مشورہ دیا تھا۔ اس پر بھائی اسے لے کر ایک بار بمبئی آیا تھا مگر اس کو بھی اب دس سال ہو چکے تھے۔ اس کے بعد میں نے اسے دیکھا تک نہ تھا لیکن وہ باقاعدگی سے محرم کا ملیدہ مجھے ہر سال بمبئی بھیجتی تھی۔ جب میں بیمار پڑا تو اس نے کسی بمبئی آنے والے کے ہاتھ مجھے گھر کا بنا ہوا گھی بھجوایا تھا اور اسی کے ہاتھ گھر آنے کا پیغام بھی بھیجا تھا۔

ان پندرہ برسوں میں اس نے مجھے کوئی چٹھی نہیں لکھی مگر بابا یا بھائی کی لکھی ہوئی چٹھی پڑھتے ہوئے مجھے لگتا کہ اس کا مضمون اسی کا ہے۔ میں نے ہنس کر کہا:

تمہاری طبیعت تو پہلے جیسی لگتی ہے لیکن بھائی ایسا کیوں دکھائی دے رہا ہے؟

دیکھو! اس نے تاکید سے کہا، دیکھو کیا ہوا ہے۔

بھائی آپ ہی مسکرایا۔ اس کا نرخرہ اوپر نیچے ہونے لگا اور میں نے سوچا: اس کی اس حالت کا میں بھی تو ذمہ دار ہوں۔ میں نے گھر کی تمام ذمہ داری ٹال دی۔ اپنی زندگی بھی تباہ کر لی اور اسے بھی مصیبت میں ڈال دیا۔ گھر میں میری چھوڑی ہوئی کمی بھی اسی نے پوری کی۔ اپنے بوجھ کے ساتھ ساتھ میری جھٹکی ہوئی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اسی نے اٹھایا۔ اس کی حالت ایسی تھی جیسے کام چور بیل کے ساتھ گاڑی کھینچنے والے دوسرے بیل کی ہوتی ہے۔ جوے کا پورا بوجھ اس ے اپنے جھکے ہوئے کاندھے پر اٹھائے رکھا۔

وہ ہنسا اور مجھے کسی ایسے بیل کا خیال آیا جو دکھتے ہوئے کندھوں پر کمر توڑ بوجھ فرمانبرداری سے اٹھائے ہوئے رکی ہوئی گاڑی کو پھر سے کھینچنا شروع کر رہا ہو۔ مجھے بے بسی اور اذیت کا احساس ہوا۔ اس کی ہنسی تھمی تو اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ کچھ دیر بعد بولا:

یقین نہیں آتا کہ تم واقعی آ گئے ہو۔ لوگوں کو خبر ملی تو وہ حیرت میں پڑ جائیں گے۔

بھائی آپ ہی مسکرایا۔ اس کا نرخرہ اوپر نیچے ہونے لگا اور میں نے سوچا: اس کی اس حالت کا میں بھی تو ذمہ دار ہوں۔ میں نے گھر کی تمام ذمہ داری ٹال دی۔ اپنی زندگی بھی تباہ کر لی اور اسے بھی مصیبت میں ڈال دیا۔ گھر میں میری چھوڑی ہوئی کمی بھی اسی نے پوری کی۔ اپنے بوجھ کے ساتھ ساتھ میری جھٹکی ہوئی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اسی نے اٹھایا۔ اس کی حالت ایسی تھی جیسے کام چور بیل کے ساتھ گاڑی کھینچنے والے دوسرے بیل کی ہوتی ہے۔ جوے کا پورا بوجھ اس ے اپنے جھکے ہوئے کاندھے پر اٹھائے رکھا۔

حیرت کی کیا بات ہے؟ انہیں تو میں یاد بھی نہیں ہوں گا۔

واہ! ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ تمہاری تصویریں دیکھتے رہتے ہیں۔

بھابی آٹا گوندھتے ہوئے بیچ میں بولی: آج کل تو بچے بھی اخبار پڑھنے لگے ہیں۔ گاؤں میں دسیوں اخبار آتے ہیں۔

لوگ اخبار خرید کر پڑھتے ہیں؟

ہاں۔ پہلے کی طرح نہیں جب اخبار پڑھنے کے لئے چپلن جانا پڑتا تھا۔ بھائی نے زور سے کہا۔ جب تمہاری خبر لگتی ہے تو لوگ اور زیادہ خریدتے ہیں۔ وہ بابا کو لا کر دکھاتے ہیں۔

پھر بابا کیا کہتے ہیں؟ میں نے مذاق میں پوچھا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر چہرے کو سنجیدہ تاثر کو کوشش سے بدل کر بولا، کچھ خاص نہیں، بس کہتے ہیں، ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ مگر خدا کو نہیں مانتا، یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

اور وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں سے پانی بہہ نکلا۔

جب مجھے دل کا دورہ پڑا تو ڈاکٹر نے مجھے بمبئی سے باہر جا کر آرام کرنے کی صلاح دی تھی لیکن اس وقت علاج چل رہا تھا اور مجھ میں فوری سفر کی طاقت نہ تھی۔ اس لئے میں کہیں نہ گیا۔ کچھ دن بعد جب میری حالت کچھ بہتر ہوئی تو ڈاکٹر نے دوبارہ مجھے کہیں جا کر لمبا آرام کرنے کو کہا۔ شہر سے باہر کسی جگہ چلے جایئے۔ اس نے کہا: لمبا آرام کئے بغیر آپ کی حالت نہیں سنبھلے گی۔

تب بھی مجھے اپنے گاؤں لوٹنے کا خیال نہیں آیا۔ میں نے پونا جانے کا ارادہ کیا۔ تب تک میری بیماری کی خبر گھر پہنچ گئی اور والد نے خط لکھ کر مجھے گھر آنے کو کہا۔

ان کے خط باقاعدگی سے آیا کرتے تھے۔ شروع شروع میں مجھے ان خطوں میں میرے دور جانے کی تکلیف محسوس ہوتی تھی۔ بعد میں میرا یہ احساس دھیما پڑتا گیا۔ پندرہ سال پہلے سیاست کے ریلے میں بہہ کر جب میں نے گھر چھوڑا تب ہمارے راستے الگ ہو گئے تھے لیکن انہوں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ ان پندرہ برسوں میں کبھی گھر نہیں آؤں گا۔ وہ ہر خط میں مجھے گھر آنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے۔ ان

کے خطوں کا میں کبھی بروقت جواب نہ دیتا۔ میں انتظار کرتا کہ تین چار خط جمع ہو جائیں اور پھر ایک پوسٹ کارڈ پر دو چار سطریں گھسیٹ کر کر بھیج دیتا اور چھٹی پالیتا۔ گھر آنے کے مطالبہ کا میرے خط میں اکثر کوئی جواب نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھار میں انہیں لکھ دیتا کہ میں کام کے باعث بہت مصروف ہوں اور فی الحال گھر آنے کی فرصت نہیں ہے۔ وہ میرے اس جواب پر کوئی ردِّعمل ظاہر نہ کرتے۔

پندرہ سال پہلے میں نے ایک خاص صورت حال میں گھر چھوڑا تھا۔ تب مجھے سیاست کی کچھ زیادہ سمجھ بوجھ بھی نہ تھی لیکن اسلام کے احیاء کا خیال جس طرح تمام مسلمانوں کو جذباتی بنا دیتا ہے، اس کا میرے ذہن پر کبھی کوئی اثر نہ ہوا۔ میں راشٹر سیوا دل (ا) سے وابستہ تھا اور سر پر گاندھی ٹوپی پہنتا تھا۔ ان دنوں گاندھی ٹوپی پہننا خود ہی اسلام سے غداری کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔

آزادی کے بعد صورتِ حال بدل گئی۔ مسلمان سماج کا جوش کم ہو گیا لیکن میرے تئیں ان کی تلخی میں کوئی کمی نہ آئی۔ میں سیاست میں زیادہ ملوث ہوتا گیا۔ آخرکار پارٹی کے کام کی خاطر بمبئی نکل آیا۔ تب تک والد کے اور میرے ذہن کا فاصلہ بہت بڑھ چکا تھا۔ جب میں نے بمبئی جانے کا ارادہ کیا تو انہوں نے اس کی مخالفت نہ کی لیکن انہیں میرا فیصلہ پسند نہ آیا تھا۔ انہوں نے پوچھا:

ساری عمر یہی رہو گے؟ اور کماؤ گے نہیں؟ پیٹ نہیں بھرو گے؟ اپنا، اپنے کنبے کا؟

میں نے انہیں جواب نہ دیا اور ایک آدھ دن میں گھر چھوڑ کر نکل گیا۔

اس کے بعد گھر جانے کا خیال مجھے عجیب سا لگتا۔ مجھے یہ خوف ہمیشہ لاحق رہتا کہ فرض کا جو بوجھ میں نے کبھی آسانی سے اتار پھینکا تھا، وہ مجھ پر دوبارہ لاد دیا جائے گا۔ میں جانتا تھا کہ میرے گاؤں کے مسلمان مجھے پہلے کی طرح پھٹکاریں گے۔ ان کے درمیان رہتے ہوئے ان سے دوری کا احساس میرے ذہن سے اب بھی دور نہ ہوا تھا۔

میرے بیمار پڑنے کے بعد والد نے ایک بار پھر خط میں مجھ سے گھر آنے کا مطالبہ کیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری دوری سے پیدا ہونے والی تکلیف اس خط میں دوبارہ ابھر آئی ہے اور آرام کرنے کے لئے گھر چلے آنے کا خیال میرے ذہن میں آیا۔ تب ایک دن میں اپنے کچھ کپڑے، ڈاکٹر کا نسخہ اور چند کتابیں لے ایک بیگ میں ڈال کر میں نے ایس ٹی کی بس پکڑی۔

> بارشیں ختم ہوئیں اور دھیرے دھیرے دھول اڑنے لگی اور ٹھنڈی نرم ہوا کے ساتھ چھتوں پر بیٹھنے لگی۔ برسوں بعد میں نے کسی نوآموز کی طرح ایک بار پھر موسم کو بدلتے محسوس کیا۔ یہ دھول ابھی اسی طرح جمتی رہنے والی تھی۔ ہر روز کی من بھر دھول۔ وہ مکانوں کے اوپر ہوا میں غبار بن کر ٹھہرنے والی تھی۔ فروش پر اس کے ڈھیر جمع ہونے والے تھے جنہیں ہٹانے کی کوئی زحمت نہ اٹھاتا۔ آخر اسے کون جھاڑے، کتنی بار جھاڑے اور اس کا فائدہ کیا۔ دھول تو روز اڑے گی اور آ کر بیٹھے گی، جمع ہوگی اور اپنے آپ صاف ہو جائے گی۔

اگلے دن محسوس ہوا ہمارے پورے گھر کی کایا ہی پلٹ گئی ہے۔

بھابی نے پورا گھر جھاڑ پونچھ کر صاف کر ڈالا۔ فرش پر گوبر سے لپائی کرائی۔ بابا نے اپنی آرام کرسی میرے حوالے کر دی۔ میں اس آرام کرسی پر دن بھر لیٹا رہنے لگا اور وہ برآمدے کے چبوترے پر تکئے کی ٹیک لگا کر بیٹھنے لگے۔

میرے آنے کی خبر سن کر لوگ مجھے دیکھنے آنے لگے۔ لوگوں کے برتاؤ سی اسی بات پر تعجب ظاہر ہوتا کہ میں پندرہ برس بعد گھر لوٹ آیا ہوں۔ ان میں سے کچھ لوگ میری عیادت کرنے آتے تو بابا انہیں میری بیماری کی تفصیل بتاتے اور سننے والوں کو ایسا لگتا جیسے انہیں دل کی بیماری کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔

پندرہ بیس دن میں نے گھر سے باہر قدم نہ رکھا۔ آرام کرنے سے میری حالت پر اچھا اثر پڑا۔ میرے بدن میں توانائی لوٹنے لگی اور اعضا میں جان پڑنے لگی۔ میری سوکھ چکی کلائیاں بھرنے لگیں۔ دھنسی ہوئی آنکھیں ابھرنے لگیں۔ جلد کی رنگت جو پیلی پڑ گئی تھی، اس میں پھر سرخی سی آنے لگی۔ مجھے خود میرا بدن جوش سے بھرا محسوس ہونے لگا۔

اور پھر دیوالی آئی۔ دھنکی ہوئی روئی جیسے بکھرے بادل آسمان سے غائب ہو گئے۔ دھان کی کٹائی پوری ہوئی۔ وادی میں اگے ہوئے کھیت ویران ہو گئے۔ واششٹھی ندی کا بارش سے میٹھا پانی پھر سے بے مزہ ہو کر کھاری ہونے لگا اور دھنک کی کمان کی شکل کے ندی کے چوڑے پاٹ میں جوار آنے پر مچھلی پکڑنے والے پرندے غوطہ لگانے لگے۔

بارشیں ختم ہوئیں اور دھیرے دھیرے دھول اڑنے لگی اور ٹھنڈی نرم ہوا کے ساتھ چھتوں پر بیٹھنے لگی۔ برسوں بعد میں نے کسی نوآموز کی طرح ایک بار پھر موسم کو بدلتے محسوس کیا۔ یہ دھول ابھی اسی طرح جمتی رہنے والی تھی۔ ہر روز کی من بھر دھول۔ وہ مکانوں کے اوپر ہوا میں غبار بن کر ٹھہرنے والی تھی۔ فروش پر اس کے ڈھیر جمع ہونے والے تھے جنہیں ہٹانے کی کوئی زحمت نہ اٹھاتا۔ آخر اسے کون جھاڑے، کتنی بار جھاڑے اور اس کا فائدہ کیا۔ دھول تو روز اڑے گی اور آ کر بیٹھے گی، جمع ہوگی اور اپنے آپ صاف ہو جائے گی۔ برسات آنے سے پہلے سب لوگ

اپنے گھر جھاڑ پونچھ کر صاف کریں گے اور دھول کے ڈھیر اٹھا کر اپنے گھروں کے پچھواڑے صحن میں لا پھینکیں گے۔ پھر ایک دن بارش کی بھاری، گول طوفانی بوندیں دھول کے ڈھیروں پر گریں گی۔ وہ پہلے بارش کی بوندوں کو خود میں جذب کرنے اور پھر سے اٹھنے کی کوشش کرے گی، بارش کی ٹھنڈی بوندوں کو پی جانے کی کوشش کرے گی لیکن ناکام رہے گی۔ آخر کار دھول سے ایک سوندھی مہک اٹھے گی، جس سے دانتوں میں میٹھا درد جاگ اٹھے گا اور وہ بارش میں کھل جائے گی۔ اگلی فصل کٹائی کے بعد پھر سے گھر گھر میں نمودار ہونے کے لئے غائب ہو جائے گی!

صبح کے وقت اب کہرا پڑنے لگا تھا۔ سورج ابھرنے پر دھند غائب ہو جاتی لیکن واششٹھی ندی کے پاٹ کے اوپر منڈلاتی رہتی۔ میں پچھواڑے کے صحن میں آ کر بیٹھنے لگا اور ہوا کے ساتھ بہہ کر آتی ہوئی دھول کو اپنے چہرے پر محسوس کرنے لگا۔

رفتہ رفتہ میں نے گھر کیسے باہر نکلنا شروع کیا۔ شام کے وقت دو تین فرلانگ چل کر مجھے پہاڑی کی ڈھلان پر سجا ہوا پورا قصبہ دکھائی دینے لگتا اور پندرہ برسوں میں ہو چکی تبدیلیوں کے نشان محسوس ہونے لگتے۔ قصبے سے گزر کر مشرق سے مغرب کی سمت جانے والی سڑک اب باہر سے چکر کاٹ کر جاتی تھی۔ اب اس کے بل نکالے جا چکے تھے اور وہ قصبے سے آدھ فرلانگ باہر سے گزرتی تھی اور بالکل سیدھی معلوم ہوتی تھی۔ مغرب کی طرف کرانے کی دکان باقی رہ گئی تھی لیکن پرانی سڑک کے کنارے واقع قادر خان کی دکان اس تبدیلی کی زد میں آ گئی تھی۔

قصبے کے باہر سے آنے والے اس کے گاہک غائب ہو گئے تھے۔ اب اس کے حصے میں صرف گاؤں کے مہار اور کلواڑی گاہکوں کی معمولی قسم کی ضرورتیں پوری کرنا رہ گیا تھا۔ قصبے کے کچھ مسلمانوں نے نئے مکان بنا لئے تھے۔ چونے اور پتھر کے بنے پرانے اور بڑے مکانوں کے سامنے کھڑی کنکریٹ کی دیواروں اور منگلوری کھپریلوں سے منڈھی چھتوں والے ان کے مختصر مکان نمایاں دکھائی دیتے تھے۔ بعض پرانے مکان تو اب کھنڈر ہو چلے تھے۔ ان کھنڈروں میں ابھرے ہوئے نیو کے پتھر دور سے نظر آتے تھے۔

ایک دن میں چلتے چلتے مغرب کی طرف جا نکلا۔ اس طرف واقع پرچون کی دکان کا مالک قصبے سے باہر آیا تھا۔ اس دکان کی بغل میں گاؤں کے جنار دھن نائی نے اپنی دکان لگا لی تھی۔ میں سڑک سے گزر رہا تھا کہ وہ اپنے تولئے سے بال جھاڑنے کے لئے نکلا اور اس کا دھیان میری طرف گیا۔ بالوں کے گچھے کو جھٹک کر ہوا میں اڑاتے ہوئے وہ بولا۔ باہر باہر سے کیوں جا رہے ہیں؟ اندر آیئے نا۔ میں اس کی دکان میں چلا گیا۔ اس کا سیلون بہت چھوٹا تھا اور دیہاتی انداز میں ٹوٹے پھوٹے سامان سے سجایا گیا تھا۔ میں وہاں پڑی ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔

ایک دن میں چلتے چلتے مغرب کی طرف جا نکلا۔ اس طرف واقع پرچون کی دکان کا مالک قصبے سے باہر آیا تھا۔ اس دکان کی بغل میں گاؤں کے جنار دھن نائی نے اپنی دکان لگا لی تھی۔ میں سڑک سے گزر رہا تھا کہ وہ اپنے تولئے سے بال جھاڑنے کے لئے نکلا اور اس کا دھیان میری طرف گیا۔ بالوں کے گچھے کو جھٹک کر ہوا میں اڑاتے ہوئے وہ بولا۔ باہر باہر سے کیوں جا رہے ہیں؟ اندر آیئے نا۔ میں اس کی دکان میں چلا گیا۔ اس کا سیلون بہت چھوٹا تھا اور دیہاتی انداز میں ٹوٹے پھوٹے سامان سے سجایا گیا تھا۔ میں وہاں پڑی ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔

طبیعت کیسی ہے؟ اس نے استرا ہاتھ سے رکھتے ہوئے پوچھا۔ دکان میں بیٹھے اکیلے گاہک کے جانے کے بعد ہم دونوں رہ گئے۔ مجھے کوفت ہونے لگی کہ اب اس کو باتیں بنانے کا پورا موقع ہاتھ آ گیا ہے۔ مجھے ابھی آگے جانا تھا اور میں جان گیا کہ اب وہ مجھے کہیں نہیں جانے دے گا۔

طبیعت ٹھیک ہے، بہتر ہو رہی ہے۔ میں نے کہا۔

بہتر تو ہونی ہی چاہئے۔ گاؤں کی ہوا ہی ایسی ہے۔ اس نے جواب دیا۔ پھر وہ قصبے کی خوبیوں کا بکھان کرنے لگا۔ اجی گاؤں کا تو پانی ہی دوا ہے! طبیعت تو بہتر ہو گی ہی۔

ہاں یہ تو سچ ہے! میں نے ہنس کر کہا۔ تمہارا کیا حال ہے؟ دھندا کیسا چل رہا ہے؟

دھندا پانی؟ وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ کیا بتائیں بمبئی والو! یہاں میں نے اپنے دام گھٹا دئے ہیں پھر بھی گاہک ہیں کہ بازار والے سیلون کی طرف ہی دوڑتے ہیں۔

اس نے اپنی جیب سے بیڑیوں کا بنڈل نکالا، ایک بیڑی مجھے دی اور ایک خود سلگائی۔ بیڑیاں کڑ اکے پتوں کی طرح بنی ہوئی تھیں اور میں سگریٹ نہ ہونے پر ان سے کام چلانے کا عادی تھا۔ میں نے بیڑی سلگائی اور دھیرے دھیرے کش لینے لگا۔

اپنی بیڑی سے دھواں نکالتے ہوئے وہ بولا۔ پندرہ سال بعد آپ گھر لوٹے۔ اتنے دن گھر کی یاد نہیں آئی؟

واہ، آئی کیوں نہیں۔

پھر آئے کیوں نہیں؟

جی نہیں چاہا۔

یہ بھی صحیح ہے۔ وہ اپنے آپ سوچتے ہوئے بولا۔ آپ کو یہاں گھٹن محسوس ہوتی تھی۔

میرا خود بھی یہی حال ہے۔ یہاں نائی لوگوں سے اپنی بنتی نہیں ہے۔ سالے سب بلونے کے چکر میں پڑے رہتے ہیں۔ سوچتا ہوں گاؤں چھوڑ کر نکل ہی

جاؤں۔ بمبئی چلا جاؤں۔

تو چلو!

لیکن دل نہیں مانتا صاحب! آپ نے تو اپنا دل کڑا کر لیا! کٹھور ہو کر سارے سمبندھ توڑ لئے۔ یہ اپنے بس کی بات نہیں۔

لیکن تمہارا یہاں کون ہے؟

ویسے تو کوئی نہیں ہے۔ پر گاؤں تو ہے نا۔ اپنا گاؤں۔ اسے چھوڑ کر جانے کو جی نہیں کرتا اور اچانک اس نے مجھ سے سوال کیا۔ آپ نے ونود بھاوے کے اپدیش پڑھے ہیں؟

ہاں، ہاں پڑھتا ہوں۔

ونود بھاوے کہتے ہیں، پلوں کی وجہ سے شہر اور دیہات نزدیک آ رہے ہیں اور اس سے دیہات بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ ان پلوں کو توڑ دینا چاہئے۔

میں کچھ کہے بغیر بیڑی پیتا رہا لیکن وہ اس اپدیش میں ایسا محو ہو گیا جیسے وہ خود ونود بھاوے ہو۔ پھر یوں لگا کہ جیسے وہ ان کا بھکت ہو۔ ونود بھکت جنار دھن مجھے بتانے لگا، ونود بالا کھ کہتے رہیں، ان کی سنتا کون ہے، نہرو کا دھیان ادھر جائے تب نا۔

دکان اگر نہیں چل رہی تو بند کر دو۔ میں نے اس کی بڑبڑ روکنے کے لئے کہا۔

چھی چھی! بند کیسے کر دوں؟ اس نے جھرجھری لے کر کہا۔ اس نے اس خیال کو یوں جھٹک دیا جیسے اپنے تولئے سے بال جھٹکتا تھا۔ اس کا خیال تھا دکان بیچنے سے وہ گاؤں میں منھ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔

اس کا باپ خوش باش آدمی تھا۔ اس کی گانٹھ میں چار پیسے تھے۔ وہ بلونے پر زمینداروں کی حجامت کرتا تھا۔ وہ ختنہ بھی کر لیتا تھا۔ اپنے باپ لکھو کو یاد کر کے جنار دھن غمگین ہو گیا۔ بیڑی اس کے ہاتھ میں بجھ گئی۔ اسے پھینکنے کے ارادے سے وہ دکان کے دروازے سے باہر نکلا اور ٹھیک اس وقت برابر کی دکان سے بنئے کی بیوی پچھلے دروازے میں آ کھڑی ہوئی۔ جنار دھن نے اسے دیکھ کر ان دیکھا کر دیا۔ اس نے بجھی ہوئی بیڑی پھینکنے کے بجائے دوبارہ سلگا لی پھر اندر آتے ہوئے مجھ سے پوچھنے لگا۔ آپ نے دیکھا اس بنئے کی بیوی کو؟

ہاں، دیکھا، کیوں؟ میں نے تعجب سے پوچھا۔

بتاتا ہوں، بتاتا ہوں بمبئی والو! وہ ایک نئے ولولے کے ساتھ بولا۔ اس کے چہرے سے غمگینی کا تاثر زائل ہو گیا۔ وہ بنئے کی بیوی کے روپ اور چال ڈھال کے بیان میں کھو گیا۔

یہ بنیا حال ہی میں اس پرچون کی دکان میں آیا تھا۔ اس نے پچھلے قریب قریب دیوالیہ ہو چکے دکاندار سے دکان خرید کر دھندا شروع کیا تھا۔ اس کی دکان میں مال بھرا ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی دکان پر 'آج نقد کل ادھار' کا بورڈ لگا دیا تھا۔ اس نے بکری بڑھانے کے نئے نئے طریقے اختیار کئے تھے۔ اس کا دھندا خوب اچھا چل رہا تھا۔ وہ قصبے کے تمام لوگوں کو خوب پہچاننے لگا تھا۔ دو ہی چار مہینے میں اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کہاں پھنس سکتا ہے اور کہاں نہیں۔ صرف اپنی بیوی کو سمجھنا اس کے لئے مشکل ہو رہا تھا۔

اس کی فطرت، اس کی عجیب و غریب حرکتیں، شہر چھوڑنے پر اس کا اصرار، وہ سمجھ نہیں پایا تھا۔ شہر میں بھی اس کی دکان اچھی چل رہی تھی لیکن وہاں اس کا جی نہیں لگتا تھا۔ وہ اس سے مسلسل شہر چھوڑنے کی فرمائش کرتی رہتی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ یہاں بالکل نہیں رہ سکتی۔ بنئے پر اس کی حکومت چلتی تھی۔ اس کی خواہش کے سامنے سر جھکا کر وہ یہاں چلا آیا تھا۔

بنئے کی بیوی لمبی اور سندر تھی۔ وہ اس کے مقابلے میں ٹھگنا اور دبلا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ پیچھے کی کھولی میں رہے اور گاہکوں کے سامنے نہ آئے۔ جب بھی وہ باہر نکلتی وہ اسے واپس اندر جانے کو کہتا۔ یہ روک ٹوک اسے پسند نہیں تھی۔ وہ چڑھ جاتی۔ ضد کر کے بار بار باہر نکلتی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس پر بلاوجہ شک کرتا ہے اور وہ اسے منانے کی کوشش کرنے لگتا اور جنار دھن اپنی دکان میں بیٹھ کر بیڑی کے کش لیتے ہوئے ان دونوں کی یہ بات چیت سنا کرتا۔

لیکن اسے اپنے شوہر سے لگاؤ تھا۔ وہ بازار خریداری کے لئے جاتا اور رات کو لوٹنے میں دیر کر دیتا تو وہ بے چین ہو جاتی۔ اسے شوہر کی فکر لگی رہتی اور اکیلے پن کا ڈر بھی۔ وہ اس خیال سے جنار دھن کو بھی رکنے کو نہ کہتی کہ یہ اس کے شوہر کو اچھا نہیں لگے گا۔ پچھلے دروازے میں بے چین کھڑی رہتی اور اس کی بے چینی کو بھانپ کر جنار دھن اس کے کہے بغیر رک جاتا۔ اندھیرے میں اکیلا بیٹھا بیڑی پھونکتا رہتا۔ بنئے کے لوٹنے کی آہٹ پاتے ہی وہ چل دیتا۔ اندھیرا چھانے لگا تھا اور بنئے کی بیوی اداس ہو کر پچھلے دروازے میں آ کھڑی ہوئی تھی۔ بنیا شہر گیا ہوا۔ شاید جنار دھن کو آج بھی رکنا تھا۔

میں اس سے رخصت لے کر گھر لوٹ گیا۔

گھر کی بتیاں جلی ہوئی تھیں اور سب لوگ باورچی خانے میں جمع ہو گئے تھے۔ وہ میری ہی راہ دیکھ رہے تھے۔ بھابی نے بابا اور بھائی سے کھانا کھانے کو کہا تھا مگر انہوں نے کہا کہ وہ میرا انتظار کریں گے لیکن میرے آتے ہی انہوں نے جلدی مچا دی۔

دیکھو آ گیا، مجھے دیکھتے ہی دونوں بولے اور فوراً کھانا لگانے کو کہا۔ کھانا خاموشی سے پورا ہوا اور میں آنگن میں آ گیا۔

رات جیسے اچانک دن پر آ پڑی اور دن خوشگوار چاندنی پوری دھرتی پر پھیل گئی۔ ڈوب چکے سورج کی تپش ٹھنڈی پڑ گئی۔ قصبے کے گھروں میں شامل کی بتیاں جس طرح جلدی جلائی گئی تھیں اسی طرح جلدی بجھا دی گئیں۔ پھر سے خاموشی چھا گئی۔

گھر کے اندر سے بابا نے مجھے آواز دی۔

اتنی ٹھنڈ میں اب تک کیوں جاگ رہے ہو؟ اندر آ کے سو جانا۔

لیکن میرا اندر جانے کو جی نہ چاہا۔ میں اسی طرح ٹھنڈ میں اداس کھڑا رہا اور تب اچانک کسی عورت کی چیخیں اس خاموش ماحول میں گونجنے لگیں۔ پہلے پہل یہ چیخیں دبی ہوئی اور وقفے وقفے سے سنائی دیں۔ لگتا تھا جیسے کسی نے اس عورت کا گلا دبوچ رکھا ہو اور وہ بڑی کوشش سے چیخ پا رہی ہو پھر جیسے گلا دبانے والے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے اور ان کی گرفت کمزور ہو گئی۔ چیخنے کی آواز صاف، اونچی اور پہچان میں آنے والی سنائی دینے لگی۔ فوراً میرے دماغ میں آ گیا کہ وہ سدام کی بہو کی آواز تھی۔ پچھلے کچھ دنوں کے آرام سے میرے زخموں پر جو کھرنڈ آ گیا تھا وہ اکھڑ گیا اور درد کی کاٹ سے خون بھل بھل بہنے لگا جو بدن بھرا بھرا لگنے لگا تھا اب اس کا رواں رواں جمتا محسوس ہونے لگا۔ ان تیز دھار، کربناک چیخوں نے ہوا سے ٹھنڈک کی لہر اتار پھینکی۔ اب اس ہوا میں صرف چیخیں بھری تھیں۔ ہوا ان سے پوری طرح بھر گئی۔ بابا کی تنہا آواز ایک بار پھر آئی۔

اب تک باہر کیا کر رہے ہو؟ اندر آ کر سو کیوں نہیں جاتے؟ بہت دیر ہو گئی ہے۔

سدام کی بہو کے گلے سے کبھی کبھی رات برات نکلنے وال یہ چیخیں پورا قصبہ برسوں سے سنتا آیا تھا۔ جب میں یہاں رہتا تھا تب میں نے بھی انہیں سنا تھا۔ قصبے کے لوگ تو سنتے ہی آئے تھے اور میں برسوں بعد پھر سے سن رہا تھا۔

سدام کی بہو کو جب میں نے پہلی بار دیکھا تو وہ ہمارے کھیت میں گھٹنوں گھٹنوں کیچڑ میں کھڑی دھان بونے میں جُٹی تھی۔ تب اس کا شوہر زندہ تھا۔ بہت تیز بارش ہوئی اور بند کے کنارے پر کھڑے ہو کر میں نے اسے اوڑھنے کے لئے گھونگھڑی اٹھانے کے لئے کیچڑ میں لپکتے دیکھا۔ اس کے روپ کے اس درشن نے اس پل مجھے پاگل کر دیا لیکن جذبات کی لہر میں بہہ جانے کی مجھے عادت نہ تھی۔ میں نے نفس کشی ہی سیکھی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کے پیچھے پڑ کر میں نے سارے قصبے میں خود کو تمسخر کا نشانہ بنا لیا ہوتا، مجھے یہ چیخیں سنتے ہوئے خیال آیا لیکن کچھ ہی دنوں میں اس کا شوہر اچانک چل بسا اور وہ گھر بیٹھ گئی۔ سدام کے اس بڑے گھر میں وہ اور اس کی بیوہ بہو رہنے لگے اور کچھ وقت کے بعد کبھی کبھار اس کی چیخوں سے نائیوں کی بستی گونجنے لگی۔ شوہر کے نہ رہنے سے اس کا دماغ چل گیا ہے۔ رات کو وہ مجھے جلانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کا مرض لاعلاج ہے۔ اس لئے مجھے اس کو باندھ کر رکھنا پڑتا ہے۔ اسی لئے اس کے بدن پر نشان دکھائی دیتے ہیں۔ سدام سب کو بتانے لگا۔ لیکن جب سارے نائی اپنے بقچے لے کر منھ اندھیرے باہر نکلتے اور صبح کی نرم دھوپ میں ان کی بیویاں باہر آ بیٹھتیں تو سدام کی بہو رو کر بتاتی کہ سدام اس کے ساتھ زبردستی کرتا ہے۔ پھر یہ کہانی قصبے بھر میں پھیل گئی۔

کچھ دیر بعد وہ چیخیں کم ہوتے ہوتے ہوا میں غائب ہو گئیں۔ مجھے خاموش روشن چاندنی کا پھر سے احساس ہونے لگا۔ ہوا میں ٹھنڈک کی لہر پھر سے بدن میں جھرجھری پیدا کرنے لگی۔ خود کو بالکل بے طاقت پا کر میں اٹھ کر اندر چلا آیا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔

لیکن قصبہ کے لوگوں کے لئے سدام کی بہو کا قصہ ہی بات چیت کا واحد موضوع نہیں تھا۔ دھوبن کے بارے میں بھی کچھ ایسی ہی متنازعہ باتیں مشہور تھیں۔

اس دوران دھوبیوں کا یہ گھر بالکل اجڑ چکا تھا۔ چاروں بھائی یکے بعد ایک چل بسے اور صرف ان کی چھوٹی بہن زندہ بچی۔ قصبے میں دھوبیوں کا یہ واحد گھر تھا۔ آبادی کے بالکل کنارے پر، تقریباً جنگل میں۔ اس کے ارد گرد گھنی جھاڑیاں اور پیڑ، نیچے وادی میں بہت دور، برہمنوں کے مکان بنے ہوئے تھے۔ پتھر کی سلوں سے بنا ایک ٹوٹا پھوٹا زینہ جس کے پتھر اب ٹوٹ پھوٹ کر اور بکھر گئے تھے، دھوبیوں کے گھر کی طرف جاتا تھا۔ دھوبن مسلمانوں کے کپڑے دھویا کرتی تھی۔ وہ گھر جا کر میلے کپڑے جمع کرتی اور دھلے ہوئے کپڑے پہنچاتی۔ دن میں وہ بھٹی چڑھاتی اور رات کو استری پھیرتی۔

اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ باپ کی موت کے بعد بھائیوں نے اور بھائیوں کی موت کے بعد اس نے اپنا خاندانی پیشہ جاری رکھا۔ کپڑوں کی دھلائی کے چکر میں اسے اپنی شادی کا خیال ہی نہ آیا تھا۔ اب پینتیس برس کے لگ بھگ عمر ہو جانے کے بعد شادی نہ کرنے کا افسوس بھی دل سے مٹ گیا ہوگا۔

میرے گھر واپس آنے کے بعد وہ بغیر کہے میرے کپڑے دھلائی کے لئے لے جانے آ پہنچی تھی۔ تب میں نے اتنے برسوں بعد اسے دیکھا۔ مجھے وہ بہت تھکی ہوئی دکھائی دی۔ جیسے اس کی زندگی ان برسوں میں بالکل سکڑ کر رہ گئی ہو۔ اس کا چہرہ کسی بھی قسم کے جذبے سے غیر معمولی طور پر خالی تھا۔ بہت غور سے دیکھنے پر بھی یہ سمجھنا مشکل تھا کہ وہ دکھی ہے یا سکھی۔

دھوبن کی راتیں ہمیشہ مصروف گزرتی تھیں۔ وہ کھانا کھا کر کپڑے استری کرنے کی تیاریوں میں جٹ جاتی۔ استری میں کوئلے ڈال کر سلگاتی، ایک ہاتھ سے انگاروں کو ہوا دیتی اور دوسرے ہاتھ سے کپڑوں پر پانی چھڑکتی۔ استری میں انگارے دہکنے لگتے۔ وہ بہت گرم ہو جاتی۔ اس اینڈھن کی سرخ روشنی میں اس کا چہرہ بالکل بدل جاتا۔ ایک دم الگ معلوم ہونے لگتا۔ اس کے دھنسے ہوئے گال بھرے بھرے اور نرم دکھائی دینے لگتے۔ اس کی سوکھی ہوئی جلد تازہ اور چمکدار لگنے لگتی۔ اس کے سر کے روپہلے بالوں میں پانی کے قطرے چمکنے لگتے۔ اس کا چرخ جسم اپنی گداز گولائیاں ظاہر کرنے لگتا۔ گرمی سے اس کے بدن سے پسینہ پھوٹ نکلتا۔ ہاتھ پیر، چہرے، پنڈلیاں، سب پسینے میں نہا جاتیں۔ پسینے میں شرابور بدن کو ٹھنڈک

پہنچانے کے لئے وہ سامنے کا دروازہ کھلا رکھتی۔ چولی کی گرہ ڈھیلی کر لیتی۔ اس کھلے دروازے سے خود بخود کوئی نہ کوئی مسلمان زمیندار اندر چلا آتا اور اس طرف پیٹھ کئے بیٹھی دھوبن کے پیچھے سے دبوچ لیتا۔ وہ ارجنٹ دھلائی والے کپڑوں اور دھوبن دونوں کے لئے آیا ہوتا۔ وہ کچھ کہے بغیر اپنا پسینے سے شرابور بدن اس کے حوالے کر دیتی۔ استری سے دور ہٹ جاتی۔ استری کی آگ دھیرے دھیرے بجھ جاتی اور لالٹین جلتی رہ جاتی۔ اس کے پاس آنے والے گاہکوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور وہ کسی کو ناراض نہیں کرتی تھی۔ وہ خود کبھی جذبات کے غلبے میں نہیں آتی تھی اور نہ کبھی ناراضمندی دکھاتی تھی۔

قصبے میں میرے لڑکپن کا کوئی بھی ساتھی نہیں رہ گیا تھا۔ کچھ تھے تو وہ پڑھائی ادھوری چھوڑ کر کھیتی باڑی میں لگ گئے تھے۔ کچھ قصبے سے باہر چلے گئے تھے۔ وہ ہوٹلوں میں کام کرتے تھے یا جنگل کے ٹھیکیداروں کے پاس ملازم تھے۔ ایک وکیل بن گیا تھا اور اس نے بمبئی کی عورت سے شادی کی تھی۔ سال میں ایک باقاعدگی سے گھر آتا اور مہینہ بھر رہ کر واپس لوٹتا۔ اس کے ساتھ آئی اس کی بیوی کی قصبے میں بہت آؤ بھگت ہوتی۔ ان پڑھ عورتوں کی سمجھ میں نہ آتا کہ اسے کہاں اٹھائیں، کہاں دھریں۔

قصبے کی کوئی لڑکی انگریزی چوتھی کلاس سے آگے نہیں گئی تھی۔ بیشتر لڑکیاں پرائمری اسکول ہی میں تعلیم کو خیرباد کہہ دیتیں۔ صرف زیتون انگریزی اسکول میں گئی تھی۔ وہ میری ہم جماعت تھی لیکن چوتھی میں ہی اس کے باپ نے اسے اسکول سے اٹھالیا تھا۔

ان دنوں مجھے زیتون سے لگاؤ محسوس ہونے لگا۔ میں نے اسے ایک لمبا سا خط لکھا اور اس کے گھر جا کر اسے تھما کر بھاگ آیا۔ اس خط کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی ہماری کبھی ملاقات بھی نہ ہوئی اور کچھ ہی دنوں میں اس کی شادی ہوگئی۔

اس رات اچانک بہت بارش ہوئی۔ میں شادی میں نہیں گیا۔ گھر ہی میں سوتا رہا۔ بابا نے پوچھا: شادی کے گھر میں نہیں جاؤ گے؟

نہیں، میرے سر میں درد ہے۔

تو بام لگالو اور چلو۔

نہیں، مجھے نہیں چلنا۔

میں نہیں گیا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ زیتون اس رات چکرا کر بیہوش ہوگئی تو میرا دکھ اور بڑھ گیا۔ اس کی سسرال قصبے ہی میں تھی۔ شادی کے بعد اس نے پھر گھر کے باہر آنا جانا شروع کر دیا تھا لیکن میرے سامنے آنے سے کتراتی رہی۔ پھر ہوتے ہوتے اس سے میرا لگاؤ بھی خود بخود کم ہوتا گیا۔ اب اس کے دو بچے تھے اور وہ بہت بیمار تھی۔

ایک دن بابا نے مجھے اس کی عیادت کے لئے جانے کو کہا۔

''تم اس کی شادی پر بھی نہیں گئے تھے۔'' انہوں نے کہا

میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ کیا انہیں معلوم تھا کہ ایک زمانے میں مجھے اس سے محبت تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا۔ اس کے سوا کسی کو بھی اس بات کی خبر نہ تھی۔

میں نے پوچھا:

کیا بہت بیمار ہے؟

ہاں۔ لگتا ہے بچے گی نہیں۔ جاؤ، اس سے مل آؤ۔

وہ اپنے میکے آئی ہوئی تھی۔ اس روز میں پہلی بار قصبے میں گیا۔ اس کے گھر کا دروازہ بند تھا۔ میں نے دستک دی تو اس کی ماں دروازے پر آئی۔ مجھے دیکھ کر وہ دروازے سے دھیرے سے ہٹ گئی۔ ''اچھا تم ہو'' وہ گہرا سانس لے کر دھیمی آواز میں بولی۔ اس نے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ میں تمہیں دیکھنے آتی لیکن لڑکی کی ایسی حالت تھی۔۔۔۔ اور اس نے پلو سے آنکھیں پونچھیں۔

''زیتون کہاں ہے؟''

''اندر کمرے میں۔ آؤ اندر آؤ'' وہ چلنے لگی اور میں اس کے پیچھے پیچھے اندر گیا۔ اندر کے کمرے میں ہمیشہ کی طرح اندھیرا تھا۔ وہاں ایک چارپائی پر زیتون لیٹی ہوئی تھی۔ میں چارپائی کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا۔

''دیکھو کون آیا ہے؟ اس کی ماں نے کہا۔ ادھر دیکھو، آنکھیں کھولو۔''

اس کا سینہ یوں اوپر نیچے ہو رہا تھا جیسے وہ ہانپ رہی ہو۔ کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے بیمار چہرے پر شرم کا سایہ پھیل گیا۔ اس نے منھ دوسری طرف پھیر لیا اور میں باہر نکل آیا۔ اس کے لئے میری آرزو کب کی راکھ ہو چکی تھی لیکن اس کے دل میں میرے لئے جذبہ اب تک کیسے قائم تھا؟

سات آٹھ دن بعد وہ ختم ہوگئی۔ میں دوسروں کے ساتھ آخری بار اس کا چہرہ دیکھنے اس کے گھر گیا۔ میرے لوٹتے ہی بابا نے پوچھا:

''اسے مٹی دینے نہیں گئے؟''

''نہیں، میں اتنا نہیں چل پاؤں گا۔''

انہوں نے کچھ نہیں کہا لیکن جب بھائی لوٹا تو اس نے مجھ سے کہا: ''تمہارے نہ آنے کا ذکر ہو رہا تھا۔''

''ذکر؟ کیوں؟''

''لوگ کہہ رہے تھے تم اس لئے نہیں آئے کہ نماز جنازہ نہیں پڑھنا چاہتے تھے۔''

''یہ بھی صحیح ہے۔'' میں نے کہا۔

اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا۔ میں زیتون کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں یہ معمہ سلجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ کس طرح آخر دم تک اپنے جذبہ کے ساتھ وفادار رہی۔ (بشکریہ 'آج')

(جاری)

انتون چیخوف
۱۸۶۰ ۱۹۰۴

دادا پوتے ایک سے

بے خواب، اداس اور تھکی تھکی سی رات کی کھلی کھڑکیوں سے برآمد ہوکر مکھیوں، مچھروں اور پتنگوں کی بھنبھناتی ہوئی فوج نے جیسے ہلا بولا تھا۔ ادھر کچھ پیاس کی شدت بھی ایسی تھی جیسے ابھی ابھی 'ہیرنگ' مچھلی کھائی ہو۔ نیند کی حسرت دل میں لئے نہ جانے کب سے کروٹوں پر کروٹیں بدل رہا تھا اور مچھروں کے کاٹے پر اچھل اچھل پڑتا تھا مگر نیند تھی کہ آنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی اور میرے کمرے کے دوسری طرف والے کمرے میں دادا جان کا بھی یہی حال تھا۔ وہ بھی نیند کی تمنا میں بار بار پہلو بدل رہے تھے۔

دادا جان فوج سے سبکدوش وظیفہ خوار جنرل تھے اور میرے ہی ساتھ رہتے تھے۔ اس وقت ہم دونوں ہی دادا پوتے اپنے اپنے کمروں میں مکھیوں اور مچھروں کے ظلم وستم کا نشانہ بنے ہوئے دل ہی دل میں پیچ وتاب کھا رہے تھے مگر کر بھی کیا سکتے تھے۔ لاچار تھے کہ ہمارے بھگانے سے نہ تو مچھر بھاگ سکتے تھے اور نہ ہی ہم پر نیند مہربان ہوسکتی تھی۔

دادا کے کمرے سے ان کے کھانسنے کی آوازیں اور گلے سے برآمد ہونے والی خرخراہٹیں بدستور سنائی پڑ رہی تھیں۔

''کس پاگل انسان سے واسطہ پڑ گیا ہے۔ بے وقوف نکمے نوجوان تمہاری تو دن میں پانچ بار کوڑوں سے پٹائی ہونی چاہئے تھی۔''

''دادا! آپ کس کی پٹائی کی بات کر رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''بننے کی کوشش مت کرو۔ تم بخوبی واقف ہو کہ میں کس کی پٹائی کی بات کر رہا ہوں۔ تم اس لائق تھے ہی نہیں کہ تم سے نرمی کا سلوک کیا جاتا۔ تمہارے والدین نے تم پر سختی نہ کر کے تمہیں تباہ و برباد کر دیا ہے۔ تمہاری تو دروں سے مزاج پرسی ہونی چاہئے تھی تبھی تم انسان بنتے۔'' اس کے ساتھ ہی دادا کو بڑھاپے والی شدید کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔

> انتون چیخوف افسانہ نگاری کی تاریخ کی ایک عظیم شخصیت تصور کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے بے شمار کہانیاں اور ڈرامے لکھے۔ ان کی تحریریں انسانی مزاج کی غماز ہیں۔ ان کی کہانیاں اور ڈرامے روسی انقلاب سے قبل کے سماج کا بہترین عکس پیش کرتی ہیں۔ ان کے کردار ترقی پسندی کی مثالیں پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ ہندوستان میں چیخوف کی کہانیوں کے ترجمے بڑی تعداد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔
>
> سلسلۂ 'غیر ملکی ادب' کی پہلی کڑی کے طور پر چیخوف کی کہانی 'دادا پوتے ایک سے' پیش ہے جس کا ترجمہ 'رفیق شاہین' نے کیا ہے
>
> (ایڈیٹر)

''تم مچھر مار دوائی لائے۔'' دادا کی آواز پھر سنائی دی۔

''نہیں لائے نا، کیا اب بھی انکار ہے کہ تم غیر ذمہ دار، نالائق اور نکمے نہیں ہو؟''

''بہت ہو گیا دادا! بہت ہو گیا! خدا کے لئے چپ ہو جاؤ۔ اب سونے بھی دو۔''

''ادب سے بات کرو۔ مت بھولو کہ رشتے میں میں تمہارا دادا لگتا ہوں۔ میں نے تمہیں سے پوچھا ہے کہ تم ایرانی سفوف (مچھر مار دوائی) لائے کہ نہیں لائے؟''

دادا کی آواز کے سر پنچم پر پہنچ چکے تھے۔ ان کا خطبہ پھر سے شروع ہو گیا۔

''جناب والا! تہذیب و تمدن بڑی چیز ہیں۔ اچھا چال چلن اور اچھا اخلاق شرفا کی شناخت ہوا کرتے ہیں۔ تم سمجھتے ہو گے میں تمہارے چال چلن سے واقف نہیں ہوں۔ نادان نوجوان! تمہاری کوئی بھی بات مجھ سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ آج کل تم گری حرکتوں پر اتر آئے ہو۔ جوان ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم دوسروں کی بیویوں کو گمراہی کے غار میں ڈھکیل دو۔ ان کو اپنی ضرورت کے تحت جب چاہو، جہاں چاہو، لے جاؤ۔ کل ہی کرنل 'دوبیان' نے مجھ سے تمہاری شکایت کی ہے کہ تم نے اس کی بیوی کو ورغلا رکھا ہے۔ تم کل بھی اسے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ آخر یہ حق تمہیں کس نے دیا ہے کہ تم دوسروں کی ازدواجی زندگی کے تقدس پر پانی پھیر دو۔ معاشرے میں گندگی پھیلاؤ۔''

غرض کہ دادا مذہب و آسمانی صحیفوں اور پیغمبروں کے ارشادات کا سہارا لے کر مجھ پر تادیر

گرجتے اور برستے رہے اور پھر مزید سہنا میرے لئے مشکل ہوگیا تو میں نے جھنجھلا کر کہا:

''دادا! آپ کیوں زحمت فرماتے ہیں۔ دینی اور اخلاقی باتیں تو میں آپ سے بھی زیادہ جانتا ہوں۔'' میں نے بات جاری رکھی۔

''میں مانتا ہوں میرے افعال شرمناک اور قابل مذمت ہیں۔ میرا ضمیر بھی مجھے لعنت و ملامت کرتا رہتا ہے مگر میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔ مجبور و لاچار ہوں کیونکہ میں آپ پر گیا ہوں۔ آپ کے سارے کے سارے نسلی امتیازات اور اوصاف حمیدہ پوری طرح مجھ میں منتقل ہو چکے ہیں کیونکہ میں آپ ہی کے گوشت و پوست کا زائیدہ ہوں۔ میری رگوں میں آپ ہی کا شریف خون گردش کر رہا ہے۔ اب آپ ہی بتایئے کوئی آبائی اور نسلی امتیازات سے کیسے مستثنیٰ رہ سکتا ہے۔''

''کیا کہا نسلی .....نسلی امتیاز؟.....مگر تم یہ کس طرح کہہ سکتے ہو۔ میں نے تو کبھی کسی کی بیوی کو نہی چھوا؟ تم مجھ پر بہتان لگا رہے ہو۔''

''اچھا..... اچھا..... واقعی.....! دادا! لگتا ہے آپ کی یادداشت کمزور ہوگئی ہے۔ آپ بھول گئے کہ اب سے دس سال پہلے جب آپ ساٹھ سال کے تھے تب آپ نے پڑوس کی ایک عورت پر ہاتھ صاف کر دیا تھا اور وہ عورت کوئی ادھیڑ اور بیوہ نہیں تھی۔ وہ صرف سولہ برس کی تھی۔ ایک دم جوان اور خوبصورت۔ کیا اب بھی یاد نہیں آیا؟ منوچکا نام تھا اس کا''

''منوچکا؟ مگر اس سے تو میں نے شادی کی تھی۔''

''مت کہئے کسی مجبور کی بربادی کو شادی۔ وہ آپ کو ناپسند کرتی تھی۔ وہ اس شادی کے سخت خلاف تھی کیونکہ وہ جوان اور خوبصورت لڑکی تھی۔ کوئی ہم عمر اور شریف نوجوان اسے بخوشی بیوی بنا کر رکھتا اور وہ اس کے ساتھ خوش بھی رہتی مگر آپ ٹھہرے پکے تکڑم باز۔ آپ نے اپنے جنرل کے منصب، دولت کی تھیلی اور سونے چاندی کے زیورات کا سہارا لے کر اس کے غریب ماں باپ کو خرید لیا تھا۔ بے چاری بدنصیب اپنے والدین کی مخالفت بھی نہ کر سکی۔ شادی والے دن اس نے کیسا کیسا کوسا تھا اپنے آپ کو۔ پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی وہ اور جب رخصت ہو کر بطور دلہن گھر آئی تب تو قسمت کی ماری نے اپنا سر ہی پیٹ لیا تھا کیونکہ یہاں کے بجائے اپنے گھر پر رہ کر اس کے کنوارے پن کی زندگی بسر کرنا زیادہ بہتر تھا اور دادا! وہ آپ کے یہاں ٹکی ہی کب؟ یاد ہے وہ نچلے درجے کا شرابی فوجی جسے شراب پلا کر آپ اس کی مزید گپوں کا مزہ لیا کرتے تھے، وہ اسی کے ساتھ..... ہاں وہ اسی کے ساتھ تو فرار ہوگئی تھی۔ آپ بڑے خراب..... بڑے گندے ہیں دادا!''

''لگام دو اپنی زبان کو اور دودھوں دھلے مت بنو۔ تمہیں میرے ذاتی معاملات میں جھانکنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ بدمعاش! میں ٹھیک ہی کہا کرتا ہوں کہ تمہاری دروں سے پٹائی ہونی چاہئے تھی۔ جعلی انسان! کیا تم نے اپنی بھولی بھالی بہن 'داشا' کی رقم اور جائداد ہڑپ کرا سے برباد نہیں کیا کہ وہ آج دوسروں کے رحم و کرم پر بڑی کسمپرسی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ اپنے کئے پر کیا تمہیں شرم نہیں آتی؟''

''شرم دادا! جب آپ کو نہی آتی تو مجھے ہی کیوں آئے؟ آخر میں آپ کا ہی تو پوتا ہوں۔ آپ کا ہی مقلد اور چیلا ہوں۔ رام رام جپنا اور پرایا مال اپنا والا منتر تو میں نے آپ ہی سے سیکھا ہے۔ یاد ہے دادا! جب آپ 'کمیسری' (Commissary) میں تھے تو آپ نے کیا گھوٹالا کر ڈالا تھا اور جس کی وجہ سے آپ کو 'اوفا، گبیر نیا' (Gubernia,UFA) کی ہوا کھانی پڑی تھی غرض کہ ہم دادا پوتے میں اسی طرح دوبدو جنگ چھڑی رہی۔ ہم دونوں ہی تادیر ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے رہے بالآخر دادا نے لاجواب ہو کر ہذیانی انداز میں دیوار پر کھرونچے مارنا شروع کر دئے۔

اب میں نے گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے دادا کو مشورہ دیا۔

''دادا! اب اس طرح تو ہم دونوں میں سے کسی کو بھی نیند نہیں آئے گی۔ چلئے غسل کرنے باہر چلتے ہیں۔ غسل کے بعد دونوں ووڈکا (Vodka) کے جام سے لطف اندوز ہوں گے اور پھر اس کے بعد ہاتھ پاؤں پسار کر میٹھی نیند کا مزہ لیں گے۔ اٹھئے..... جلدی کیجئے!''

دادا زیر لب بڑبڑاتے ہوئے بستر سے اٹھ کر لباس زیب تن کرنے لگے اور پھر ہم دونوں ہی گھر سے باہر نکل آئے۔

چاند کی روپہلی کرنوں سے ندی کی سطح شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔ رات کی نیم غنودہ سی سبک ہوا اپنے مہکتے آنچل میں خنکی اور تازگی لئے ہوئے تھی۔ ہم دونوں نے ہی ندی کے ٹھنڈے پانی میں غوطے لگا کر تادیر تیراکی کے مزے لوٹے اور پھر وہاں سے رخصت ہو کر ٹہلتے ہوئے گھر واپس آ گئے۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی میں میز پر جھکا اور بوتل اٹھا کر دو جام بنا دئے۔ دادا نے بڑی بے صبری سے جام اٹھایا اور چھاتی پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے بڑبڑائے۔ عادی شرابی! اگر تمہاری پشت پر یومیہ دس درّے لگائے جاتے تو تم آج ایسے نہ ہوتے۔

دادا پیتے جا رہے تھے۔ سینڈوچ کترتے جا رہے تھے اور ساتھ ہی بڑبڑاتے بھی جا رہے تھے۔ اب اس سوال کا جواب کہ میں عادی شرابی کیوں ہوں، میں یہی کہہ کر دینا چاہوں گا کہ میری یہ لت آبائی اور نسلی قسم کی ہے۔ پینا میں نے اپنے ہی خاندان والوں سے سیکھا ہے۔ خوب طبیعت سے سیر ہو کر پیتا ہوں اور بے سدھ ہو کر بستر پر پڑ جاتا ہوں۔ آج کل ہم دادا پوتے کی ہر شب اسی رنگ میں بسر ہوتی ہے۔

□□□

افسانیات عابد سہیل صاحب کے چند مضامین، تین افسانوں، دو گفتگوؤں اور ایک ناول کے ترجمے پر مشتمل کتاب ہے جو ان کے انتقال کے بعد ان کی بیگم انیس عابد سہیل نے شائع کی ہے۔ کتاب اپنے مشمولات کے اعتبار سے بیحد اہم ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ افسانے پر لکھے ہوئے یا اس پر گفتگو کرتے ہوئے عابد سہیل صاحب کے جوہر خوب خوب کھلتے ہیں کیونکہ 'افسانہ' ان کی سب سے پسندیدہ صنف ہے۔

مجموعہ میں شامل 'ملاقاتیں' کے عنوان کے تحت عابد سہیل سے ایک گفتگو: ممتاز عالم، عابد سہیل اور واقعے سے افسانے تک، ایک گفتگو: نیر مسعود، عابد سہیل، انیس اشفاق، میں افسانے پر جو تفصیلی بات چیت کی گئی ہے وہ افسانے کی تکنیک، افسانے کی تاریخ، افسانے کے مستقبل پر تفصیل سے روشنی ڈالتی ہے۔ یہ بات چیت افسانے کو سمجھنے میں ہر طرح سے ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ دوسری گفتگو میں اس بات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ کون سا واقعہ کب، کیسے اور کس طرح کسی افسانے کا موضوع بنتا ہے:

''یہ تھوڑی ہوگا کہ کوئی واقعہ ہوا تو آپ نے من وعن بیان کر دیا افسانے میں۔ افسانے میں تو آپ اسے اپنے موضوع کے اعتبار سے Mould کرتے ہیں، اس کو قابل یقین بناتے ہیں، نہ صرف اپنے لئے بلکہ پڑھنے والوں کے لئے بھی۔''

مختصر یہ کہ یہ دونوں گفتگوؤں کے تعلق سے بیحد اہم بلکہ حاصل کتاب ہیں۔ نئے لکھنے والے ان سے روشنی حاصل کر کے اپنا سفر آگے جاری رکھ سکتے ہیں۔

کتاب میں 'نظریات' کے عنوان کے تحت دو مضامین 'آج کا افسانہ، چند زاویے' اور 'نئی حقیقت پسندی اور اردو افسانہ' پیش کئے گئے ہیں۔ ان دونوں مضامین کے ذریعہ سے آج کے افسانے کو سمجھنے سمجھانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے گو کہ اس مضمون میں محض چار افسانہ نگاروں کے ایک ایک افسانے سے بحث کی گئی ہے۔ کاش اسے اور وسعت دی جاتی اور کم سے کم بیس پچیس افسانہ نگاروں کی ساٹھ ستر تخلیقات اور ان کے سروکاروں سے تفصیلی گفتگو کی گئی ہوتی تو یہ مضمون افسانے کی تنقیدی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت اختیار کر لیتا۔ 'نئی حقیقت پسندی اور اردو افسانہ' میں اس بات پر غور کیا گیا ہے کہ آج کے افسانے میں سماجی حقیقت کس طرح اظہار پا رہی ہے۔ اس مضمون میں چند ممتاز افسانہ نگاروں کی تخلیقات سے مثالیں پیش کر کے اپنی بات کو واضح طور سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

کتاب میں 'مطالعے' کے عنوان کے تحت چھ مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ ان میں قمر رئیس اور افسانے کی پرکھ (یلدرم سے رتن سنگھ تک)، تین افسانے: الاؤ، بالکنی، متھن، اقبال متین کے تین افسانے (ایک غیر رسمی سا مطالعہ)، دھمک: ایک مطالعہ، عبدالصمد کے افسانے: 'سیاہ کاغذ کی دھجیاں' کی روشنی میں اور اضطراب افسانہ، اقبال

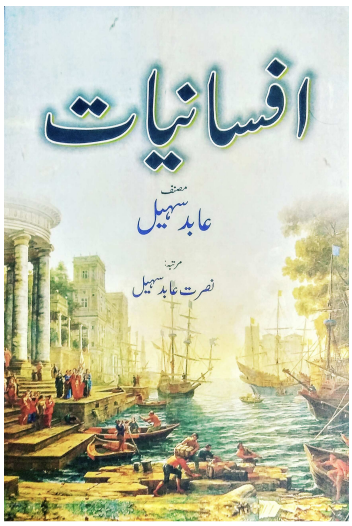

مبصر : نجیب انصاری
قیمت : 200 روپئے
ناشر : ایم۔آر۔ پبلیکیشنز، دہلی

ملنے کا پتہ

10 ہمسر وپول مارکیٹ کوچہ چیلان، دریا گنج نئی دہلی

مجید شامل ہیں۔ یہ سبھی مضامین عملی تنقید کی عمدہ مثالیں ہیں۔ قمر رئیس اور افسانے کی پرکھ (یلدرم سے رتن سنگھ تک) میں یلدرم اور رتن سنگھ کی قدر و قیمت کے تعین کے علاوہ اردو فکشن کے بارے میں قمر رئیس کے نظریے پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے اور اردو فکشن کی تنقید کے میدان میں ان کی خدمات کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔

کتاب میں شامل تین افسانے: الاؤ، بالکنی اور متھن کا مطالعہ عابد سہیل نے اپنے طور پر پیش کیا ہے۔ اس مطالعہ میں افسانے کے تکنیکی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں ان عظیم افسانوں کے مقام و مرتبہ پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ اقبال متین کے تین افسانے: ایک غیر رسمی مطالعہ درحقیقت ایک مبسوط مضمون ہو گیا ہے۔ اس میں افسانے کے فنی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اقبال متین کا افسانے کی دنیا میں مرتبہ بھی متعین کر دیا گیا ہے۔

اس کتاب میں عابد سہیل کے تین غیر مطبوعہ افسانے 'اجنبی'، 'ملاقات' اور 'پیر محمد' بھی شامل ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ کتاب کے آخر میں دیباچہ 'غیر مرئی انسان' بھی شامل ہے جو ایچ جی ویلس کے ناول دی ان ویزیبل مین کے ترجمہ سے متعلق ہے۔ اس ترجمہ سے متعلق عابد سہیل کی یادیں بیحد دلچسپ ہیں جو قاری کو محظوظ کرتی ہیں۔

'افسانیات' کو کمپوزنگ اور طباعت کی خامیوں نے بری طرح مجروح کیا ہے۔ بعض الفاظ نامکمل اور ادھورے کمپوز کئے گئے ہیں اور بعض جملے دو دو بار درج ہو گئے ہیں۔ بہرحال پروف ریڈنگ پر بہت زیادہ توجہ دینے کی ضرورت تھی۔ کمپوزنگ میں 'الف' بہت جگہ غائب ہے۔ اندازے سے یا سیاق وسباق جوڑ کر لفظ پورا کرنا پڑتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اندرونی ٹائٹل میں دونوں جگہ 'عابد سہیل' میں 'عابد' کا 'د' غائب ہے۔ اسی طرح انگریزی کے الفاظ میں بھی املے کی غلطیاں موجود ہیں۔ کمپوزنگ کی غلطیوں اور طباعت کی خامیوں کی وجہ سے بعض جملے مہمل ہو گئے ہیں۔ کتاب میں حواشی کے لئے نمبر شمار تو درج ہیں لیکن حواشی غائب ہیں۔

کتاب کے صفحہ نمبر ۶۴ پر تحریر ہے:

''اس اتفاق کی تفصیل سجاد ظہیر نے 'روشنائی' میں صفحہ ۱۱۸/اور ۱۱۹/ پر بیان کی ہے۔''

اس کے بعد روشنائی کا اقتباس درج کیا جانا چاہئے تھا لیکن اقتباس درج نہیں ہے۔

کتاب میں ایک جگہ تحریر ہے:

''سامان برسوں کا ہے پل کی خبر نہیں''

درست مصرع یوں ہے:

''سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں''

مصرعے، محاورے اور روز مرہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی ہے۔ وہ جس طرح بول چال میں رائج ہیں، اسی طرح لکھے اور بولے جائیں گے۔ تعجب ہے کہ اس کتاب میں یہ چوک کیسے ہو گئی۔

□□□ ک

اردو ادب کے دامن میں بڑی وسعت ہے۔ اس کے دامن میں بیشتر اصناف سخن سے متعلق خاطر خواہ اثاثے موجود ہیں۔ یہ بات کہنے میں تامل نہیں ہونی چاہئے کہ اردو کا مستقبل اس کے ماضی کی طرح بڑا تابدار اور روشن نظر آرہا ہے۔لیکن اردو ادب کے ساتھ موجودہ عہد میں ایک المیہ ضرور درپیش ہے۔ جو قابل تاسف ہے،موجودہ عہد میں تخلیقی ادب اپنے قحط الرجالی کے دور سے گزر رہا ہے۔اس کی ایک خاص وجہ خود تخلیق کاروں کی عاجلانہ شہرت ہے جو ان کی عدم دلچسپی اور سہل پسندی کا پیش خیمہ ہے یہ ناقابل تلافی عمل ہے جس کا سد باب قبل از وقت ضروری ہے ایک صحت مند تخلیقی ادب کے لئے۔

میں یہاں پر ناقدین کی بات نہیں کرتا اس لئے کہ نقاد کو ویسے ہی ادب کے دوسرے نمبر کا شہری تصور کیا جاتا ہے۔شکوہ تو ان لوگوں سے ہے جو بذات خود تخلیق کار ہیں لیکن وہ بھی سہل پسندی کی راہ اختیار کرنے میں عافیت محسوس کرنے لگے ہیں، یہ رویہ ہمارے ادب کے منافی ہے۔

ان باتوں سے قطع نظر اس وقت ''راجیو پرکاش ساحر'' کی ترتیب کردہ کتاب ''ایک جھروکھا افسانوں سے'' میرے ہاتھ میں موجود ہے جو مختلف افسانہ نگاروں کی تخلیقات سے متعلق ہے۔افسانہ ہمارے اردو ادب کی ایک مقبول ترین صنف سخن ہے اور موجودہ عہد میں اس تخلیقی صنف کی زلف گرہ گیر کے اسیروں کی تعداد کچھ زیادہ ہے جو افسانے کے میدان میں اپنی فکری بصیرت سے ایک سے بڑھ کر ایک افسانے تخلیق فرما رہے ہیں، اور انھیں افسانہ نگاروں میں کچھ ایسے بھی افسانہ نگار موجود ہیں جو اس صنف میں نئے نئے تجربات بھی کر رہے ہیں۔ جو افسانوی ادب کے لئے ایک خوش آئند مستقبل کی بشارت ہے۔

راجیو پرکاش ساحر خود ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ایک بہترین افسانہ نویس بھی ہیں ۔ان کے کچھ افسانے میں نے خود بھی پڑھے ہیں۔جس میں وہ کچھ نیا لکھنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ افسانہ نگاری سے ان کی محبت کا جیتا جاگتا ثبوت ان کی یہ ترتیب کردہ کتاب ہے۔جس میں انہوں نے اپنی وسعت امکان اور تحقیقی مقدور کے تحت ایک کوشش ضرور کی ہے، کہ انہوں نے کچھ اہم افسانہ نگاروں کے افسانے اس کتاب میں یکجا کئے ہیں جس کے لئے وہ قابل تحسین اور لائق مبارکباد ہیں۔ یہ کتاب اتر پردیش (لکھنؤ) کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی ہے۔

''ایک جھروکھا افسانوں سے'' یہ کتاب ۲۲۳ صفحات پر مشتمل ہے،اس کتاب کا گیٹ اپ بہت ہی دیدہ زیب ہے جو پہلی نظر میں ہی قاری کی توجہ کا نکتہ ارتکاز بن جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس میں انیس (۱۹) افسانہ نگاروں کی تخلیقات شامل ہیں۔ اس میں موجود کوئی ایسا افسانہ نگار نہیں ہے۔ جسے لوگ جانتے اور پہچانتے نہ ہوں،

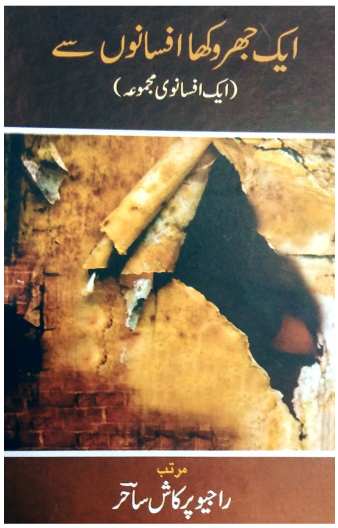

مبصر : شاہد کمال
قیمت : 500روپئے
ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

ملنے کا پتہ

20/84، رنگ روڈ، اندرا نگر، لکھنؤ

اس لئے کہ ان مذکورہ افسانہ نگاروں نے اپنے رشحات قلم سے نئے ذہنوں کی بھرپور آبیاری کی ہے،اور یہ بھی ایک اتفاق ہے اس فہرست میں کچھ نام چھوڑ کر بقیہ سارے نام لکھنو سے ہی تعلق رکھنے والے افراد پر ہی مشتمل ہیں۔جن کے افسانے ''ماہنامہ نیادور'' میں شائع ہوتے رہے ہیں۔مثلاً ڈاکٹر ملک زاداہ منظور احمد، عابد سہیل مرحوم، مسرور جہاں، عائشہ صدیقہ، محسن خاں، قائد حسین کوثر، شاہنواز قریشی، شکیل صدیقی، نیر مسعود، غزال ضیغم، سہیل کاکوروی اور منظور پروانہ وغیرہ۔ظاہری بات ہے لکھنو کے افسانوی افق پر یہی وہ نام ہیں جو کافی عرصے سے اپنی تخلیقی صناعی کے جوہر دکھا رہے ہیں، اور ان کی افسانوی تخلیقات سے نئے لکھنے والوں نے بھی کہیں نہ کہیں انھیں کی استوار کی ہوئی روش سے اپنے لئے راستے ہموار کئے ہیں۔

اس کتاب میں شامل مقتدر اور باصلاحیت تخلیق کاروں کے افسانوں سے میں شعوری طور پر کسی طرح کا تجزیاتی زوایہ فکر کو معرض بحث لانے سے انصراف کر رہا ہوں چونکہ اگر میں ان افسانوں کے اسالیب، اس کے معنوی مرموزات اور ان کے فنی نکات پر بحث وتمحیص سے کام لوں تو یہ تبصرہ تبصرہ نہ ہو کر ایک طویل مضمون کی صورت اختیار کر لے گا۔

اس کتاب کا مقدمہ مرحوم ملک زادہ منظور احمد نے لکھا ہے، جو اجمالی ہونے کے باوجود اپنے اندر ایک تفصیلی موضوعات پر بسیط ہے۔اس کتاب کے مرتب راجیو پرکاش ساحر نے پیش لفظ کی صورت میں اس کی عصری اہمیت اور معنویت پر روشنی ڈالی ہے۔اور اس کی ترتیب و تنظیم کی ضرورت کے بارے میں بھی اپنے خیال کا اظہار کیا ہے۔جس کے پڑھنے کے بعد اس کتاب کی ضرورت کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔

اس کتاب کا آغاز اقبال مجید کے افسانے سے کیا گیا ہے، اور اس کا اختتام منظور پروانہ کے ''انتقام'' پر کیا گیا ہے۔اس کا اختتامی انتقام بہت ہی دلچسپ ہے۔راجیو پرکاش ساحر نے اپنے مبلغ علم کے اعتبار سے اسے بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش ضرور کی ہے۔

اس کتاب میں ایک کمی بھی ہے وہ یہ کہ اگر راجیو پرکاش ساحر، ان بزرگ افسانہ نگاروں کے ساتھ نئے لکھنے والوں کو بھی جگہ دی ہوتی تو یہ کتاب اپنے مجوزہ خط مستقیم سے ایک نئے زاویہ انفراد کی عکاسی کرتی اور نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی ہوتی۔ مجھے امید ہے کہ اگر راجیو پرکاش ساحر اس موضوع پر مزید کام کریں گے تو اس بات کا ضرور خیال رکھیں گے۔

اس کتاب میں ترتیب و تدوین سے متعلق کچھ خامیاں ضرور ہیں جس سے انصراف نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ تحقیق و تدوین کے کچھ اصول وضوابط ہیں جس کا خیال رکھنا ہر مؤلف کی اولین ترجیحات میں ہونا چاہئے۔

❑❑❑

موجودہ حکومت کے فیصلے اور ہدایات

انتظامیہ

- ریاست کا بجٹ تیار کرنے میں عوامی فلاحی عہدنامے کے نکات پر توجہ کی ہدایت۔
- عوام کو مقررہ وقت پر سرکاری اسکیمیں مہیا کرانے کے لئے ہر ایک محکمہ کو سیٹیزن چارٹر تیار کرنے کی ہدایت۔
- ریاستی حکومت کی جانب سے ذات، مذہب، فرقہ وغیرہ کی بنیاد پر کسی کے ساتھ کوئی تفریق یا بے انصافی نہ ہونے کا عہد۔
- ضروری ازدواج رجسٹریشن کے لئے تجویز پیش کرنے کی ہدایت۔

قانونی بندوبست

- گایوں کی اسمگلنگ پر بلا تاخیر پابندی عائد کرنے کا فیصلہ کیا گیا
- خواتین کے تحفظ کے لئے تعینات پولیس اہلکاروں کو کسی کے ساتھ غیر اخلاقی سلوک نہ کرنے کی ہدایت۔
- تمام عمومی مقامات کو شر پسند عناصر سے آزاد کرانے نیز خواتین اور لڑکیوں کے ساتھ راہ چلتے چھیڑ خانی، ناروا سلوک، غیر مناسب جملے وغیرہ کے حادثات پر پابندی عائد کرنے کے لئے پوری ریاست میں مہم چلانے کی ہدایت۔
- مجرموں، اسمگلروں، زمین مافیاؤں وغیرہ پر بلا تفریق سخت ترین کارروائی کی ہدایت۔

وزیر اعلیٰ جناب یوگی آدتیہ ناتھ شاستری بھون میں سڑکوں کو گڑھوں سے پاک کرنے کی مہم کے سلسلہ میں جائزہ میٹنگ کرتے ہوئے۔ (یکم مئی ۲۰۱۷ء)

- مرد و زن کی باہمی رضایت سے کسی بھی عمومی مقام پر بیٹھنے یا ساتھ میں کہیں جانے پر انہیں کسی طرح پریشان نہ کرنے کی ہدایت۔
- پولیس کو عوام سے براہ راست گفتگو کرنے چھوٹے سے چھوٹے واقعات کا از خود علم لینے کی ہدایت۔
- امن و امان کے لئے خطرہ پیدا کرنے والے افراد کو نشانزد کر کے ان پر کارروائی کی ہدایت
- استحصال اور ایسڈ اٹیک جیسے حادثات پر جلد از جلد کارروائی کی ہدایت۔
- ہر ضلع میں اینٹی رومیو اسکوائڈ کی تشکیل اور اسے چلانے سے متعلق تجویز کو منظوری دی گئی۔

طب و صحت

- سستی شرحوں پر فراہم ہونے والی دواؤں کی تین ہزار دکانیں کھولنے کے بندوبست کی ہدایت۔
- موجودہ مالیاتی سال میں ریاست کے ۴۰ ضلعوں میں یوگ ویلنیس سینٹر قائم ہونگے۔
- آئندہ ۲۱ جون کو بین الاقوامی یوم یوگ کے موقع پر لکھنؤ میں ۵۱ ہزار افراد کی شرکت کو یقینی بنا کر باہمی یوگ نمائش پروگرام منعقد کرانے کا فیصلہ کیا گیا۔

زراعت اور کاشتکار

- گیہوں خرید نشانہ ۴۰ لاکھ میٹرک ٹن سے

اضافہ کر ۸۰؍لاکھ میٹرک ٹن کیا گیا۔

- ۳۱؍مارچ ۲۰۱۶ء تک ریاست کے ۸۶؍لاکھ سے زیادہ چھوٹے کسانوں کو جتنا بھی فصلی قرض دیا گیا ہے، اس کا ۳۱؍مارچ ۲۰۱۷ء کو بقایہ تقریباً ۳۶۰۰۰؍کروڑ روپئے معاف کیا گیا۔
- فصلی قرض معافی کی حدفی کاشتکار ایک لاکھ روپئے ہوگی۔
- معینہ مدت میں بقایہ گنا قیمت کی ادائیگی نہ کرنے والی شکرمل مالکان کے خلاف ایف آئی آر درج ہوگی۔
- آئندہ ۱۰۰؍دنوں میں سٹھیاں اوراسنیہہ روڑ امداد باہمی شکر ملوں میں نئی ڈسٹیلری اور ایتھ نال پلانٹ عوام کو معنون کیا جائے گا۔

زیر زمین معدنیات اور کانکنی

- غیر قانونی کانکنی کے لئے ضلع مجسٹریٹ اور سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس براہ راست ذمہ دار ہونگے۔
- غیر قانونی معدنیاتی کاروبار پر پابندی عائد کرنے کے سلسلہ میں پالیسی تیار کرنے لئے منسٹرس گروپس کی تشکیل دی گئی۔
- ریاست میں غیر قانونی معدنیاتی کاروبار پر پابندی عائد کرنے کے لئے نائب وزیر اعلیٰ جناب کیشو پرساد موریہ کی صدارت میں ورزاء گروپ کی تشکیل۔
- معدنی پٹوں کے لئے شفاف طور پر ای۔ ٹینڈرنگ سے کام کرنے کی ہدایت۔

میٹرو ٹرین

- الہ آباد، میرٹھ، آگرہ، گورکھپور اور جھانسی میں بھی میٹرو ٹرین چلانے کے لئے جلد از جلد ڈی پی آر تیار کرنے کی ہدایت۔

مذہبی امور

- وزیر اعلیٰ نے کیلاش مانسروور یاترا پر جانے والے تیرتھ یاتریوں کے ۵۰؍ہزار روپئے کی گرانٹ کو بڑھا کر ایک لاکھ کرنے کا اعلان۔
- تیرتھ یاتریوں کی سہولت کے لئے دہلی کے قریب و جوار اور لکھنؤ میں مناسب مقام پر کیلاش مانسروور بھون کی تعمیر کا فیصلہ۔
- آئندہ ۱۵؍جون تک ریاست کی ساری سڑکوں کو گڑھے سے پاک کرنے کی مہم۔

ای۔ٹینڈرنگ

- سبھی محکموں میں ای۔ٹینڈرنگ کو نافذ کرکے بندوبست کو صاف شفاف اور بدعنوانی سے پاک بنانے کی ہدایت۔

شہری ترقیات

- گومتی ریور فرنٹ پروجیکٹ کو 'نمامی گنگے' پروجیکٹ سے ملحق کرکے دریائے گومتی میں گرنے والے سبھی گندے پانی کے نالوں کو بند کرنے کی ہدایت۔
- ریاست میں چلائے جارہے غیر قانونی سلاٹر ہاؤس کو بند کرنے اور مشینی سلاٹر ہاؤس پر پابندی عائد کرنے کے سلسلہ میں جاری سرکاری حکم ناموں کو سختی سے نافذ کرنے کا فیصلہ۔
- شہروں میں سٹی بس بندوبست کی مستحکم کاری کی ہدایت۔

مویشی پروری ترقیات

- ریاست میں چلائی جارہی ماہی گیر ریائشی اسکیم کا نام تبدیل کرکے نشاد راج گہا رہائشی اسکیم کرنے کی ہدایت
- گورکھپور میں جانوروں کے طبی کالج کے قیام کی ہدایت۔
- دودھ دینے والے جانوروں سے دودھ حاصل کر انہیں سڑکوں پر آوارہ چھوڑ دینے والے گئو پروروں پر سخت کارروائی کی جائے گی۔

وزیر اعلیٰ جناب یوگی آدتیہ ناتھ جنتا درشن میں آئے ہوئے افراد کے مسائل کی سماعت کرتے ہوئے (۳؍اپریل ۲۰۱۷ء)

ماحولیات

- دریائے گنگا کی صفائی، روانی اور تحفظ کے لئے ضروری اقدام کی ہدایت۔
- گرین کور میں توسیع اور ایکوٹورزم کو فروغ دیا جائے گا۔

سماجی سروکار

- اقلیتی طبقہ سے تعلق رکھنے والوں کے لئے بہرائچ ضلع میں کمیونٹی سینٹر کے لئے زمین کا بندوبست کرنے کی ہدایت۔
- محکمۂ معذور عوامی ترقیات کا نام تبدیل کرکے

محکمۂ معذور عوامی خود اختیاریت کیا گیا۔

- محکموں میں معذور کوٹے سے خالی عہدوں کو جلد از جلد پُر کرنے کی ہدایت۔
- سماجوادی پنشن اسکیم کو روکتے ہوئے اس کی اہلیت کی جانچ کی جائے گی۔
- ازدواجی گرانٹ اسکیم کا نام بدل کر کنیادان اسکیم رکھا گیا۔
- درج فہرست ذات کے لئے ایک خصوصی فلاحی اسکیم تیار کی جائے گی۔
- بھاگیہ لکشمی اسکیم نافذ کرنے کے لئے وسیع تجویز تیار کرنے کی ہدایت۔
- مدارس کے نصاب کی تجدید کاری کا فیصلہ کیا گیا۔
- زچہ بچہ شرح اموات میں مزید بہتر نتائج حاصل کرنے کی حکمت عملی تیار کرنے کی ہدایت۔

ریونیو

- بغیر کسی جانچ کے زمین کی رجسٹری اور ایک ہی زمین کی رجسٹری بار بار ہونے کے واقعات کو روکنے کے لئے موثر حکمت عملی تیار ہوگی۔
- ہر ضلع میں اینٹی لینڈ مافیا ٹاسک فورس قائم کرنے کا فیصلہ۔
- زمین مافیاؤں کے ذریعہ ضبط شدہ سرکاری زمینوں کو آزاد کرانے کے ساتھ قصوروار افراد کو سزا دی جائے گی۔
- چیف سکریٹری کی صدارت میں ریاستی سطح، منطقائی کمشنر کی صدارت میں منطقائی سطح، ضلع مجسٹریٹ کی صدارت میں ضلع سطح اور ڈپٹی ضلع مجسٹریٹ کی صدارت میں تحصیل سطح پر ٹاسک فورس تشکیل دی جائے گی۔
- سرکاری/نجی آراضی/عمارتوں پر ہونے والے غیر قانونی قبضوں کی شکایتیں موصول کرنے کے لئے ریونیو بورڈ سطح پر ایک ویب پورٹل تیار کیا جائے گا۔

کاروبار

- کاروباریوں کے مفاد کے تحفظ کے لئے تاجر فلاحی بورڈ تشکیل دیا جائے گا۔

وزیر اعلیٰ جناب یوگی آدتیہ ناتھ اپنے جھانسی دورے پر ایک اسکول میں طلبہ سے تعلیم کے سلسلہ میں گفتگو کرتے ہوئے (۲۰/اپریل ۲۰۱۷ء)

آبکاری

- عدالت عظمیٰ کے احکامات پر عمل آوری کے سلسلہ میں قومی شاہراہوں پر واقع ریاست کی ۸۵۴/آبکاری دکانوں کو شہر کے بستی، تعلیمی ادارے، مذہبی مقامات اور اسپتالوں سے معینہ مسافت پر منتقل کیا جائے گا۔
- ورنداون، اجودھیا، چترکوٹ دھام، مشرکھ نیمی شارنیہ، کلیر شریف، دیوی شریف اور دیوبند کے مذہبی مقامات میں مکمل طور پر نشہ بندی پر سختی سے عمل آوری کو یقینی نہ بنانے پر متعلقہ افسران کو سزا دی جائے گی۔
- کاشی وشوناتھ مندر، وارانسی، شری کرشن کی جائے ولادت متھرا اور الٰہ آباد میں سنگم کے چاروں جوانب ایک کلومیٹر کی مسافت میں شراب کی فروخت پر نافذ پابندی پر سختی سے عمل آوری ہوگی۔
- پولیس تھانوں اور یو پی 100 کے نظام کار کو مزید چست درست بنانے کا فیصلہ۔
- ریاست میں آئندہ چار برسوں میں ہر سال تیس ہزار سپاہیوں کی مرحلہ وار تقرری کی جائے گی۔ تقرری بلا تفریق اور بدعنوانی سے پاک ہوگی۔

دیہی ترقیات

- ہمہ جہت دیہی ترقیاتی محکمہ کو محکمۂ دیہی ترقیات میں ضم کر دیا جائے۔

بندیل کھنڈ

- بندیل کھنڈ میں پینے کے پانی کی مشکلات کے حل کے لئے ہینڈ پمپوں کے قیام، ربورنگ اور پائپ کے ذریعہ پینے کے پانی کی اسکیموں کی مرمتی کاموں کے پورے کرانے کی ہدایت۔
- بندیل کھنڈ میں موجودہ مالیاتی سال میں ۴۱/عمومی ٹیوب ویل، ۱۵۹/گراؤنڈ واٹر رچارجنگ چیک ڈیم، ۱۱۶/تالابوں کی تعمیر سمیت ۱۲۰۸/نئے ڈم ویل کے تعمیراتی کام مقررہ مدت میں پورے کئے جائیں گے۔
- ہر ایک ضلع میں ضرورت کے مطابق ۱۰۰-۱۰۰ چیک ڈیم بنائے جائیں گے۔

پنچایتی راج

- ریاست کے ۵۹/ہزار گرام پنچایتوں میں سے تقریباً ۳۵۰۰/گرام پنچایتوں کو کھلے میں

رفع حاجت سے پاک کر دیا گیا ہے اور دسمبر ۲۰۱۷ء تک مزید ۳۰؍ضلعے کھلے میں رفع حاجت سے پاک ہو جائیں گے۔ ریاستی حکومت کا یہ بھی عہد ہے کہ ۲؍اکتوبر ۲۰۱۸ء تک پوری ریاست کو زیر آسمان رفع حاجت سے پاک کر دیا جائے۔

انفرااسٹرکچر

- ۱۵؍جون ۲۰۱۷ء تک ریاست کی ۸۶؍ہزار کلومیٹر کی سڑکوں کو گڑھے سے پاک کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے جس میں بطور تخمینہ تقریباً ۴۵۰۰؍کروڑ روپئے کا خرچ ہے۔ ساتھ ہی تقریباً ۳؍ہزار کلومیٹر قومی شاہراہ کی مرمت کا کام ریاستی حکومت کی جانب سے کیا جائے گا۔

جنرل ایڈمنسٹریشن

- سرکاری دفاتر اور اسکولوں میں نافذ ۱۵؍عمومی تعطیلات کو رسٹرکٹیڈ تعطیلات میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہ فیصلہ سال ۲۰۱۷ء سے نافذ ہے۔
- عظیم ہستیوں کے یوم ولادت کے موقع پر سبھی تعلیمی اداروں میں ان کے اخلاق و کردار اور موجودہ نوجوان نسل میں ان کو بطور نمونۂ عمل اپنانے کے مقصد سے کم سے کم ایک گھنٹے کی میٹنگ/سیمینار منعقد کرنے کا فیصلہ۔

واٹر کلیکشن

- آئندہ ۱۰۰؍دنوں میں مقدار سے زائد اور کریٹکل ترقیاتی بلاکوں کے لئے ماسٹر ریچارج پلان بنانے کی کارروائی ترجیحی طور پر یقینی بناتے ہوئے ۱۹۰؍تالابوں کی از سرنو مرمت اور ۹۵؍چیک ڈیموں کی تعمیر ہر حالت میں کرانے کو یقینی بنایا جائے گا۔

توانائی

- ریاست کے ہر گھر میں ۲۴؍گھنٹے بجلی سپلائی کے عہد کو پورا کرنے کے لئے 24X7 پاور فار آل مفاہمت نامے پر ریاستی حکومت اور حکومت ہند کے مابین قرار ہوا۔
- دیہی صارفین کے لئے ٹول فری نمبر 1912 شروع کیا گیا ہے تاکہ وہ اپنی بلنگ، بجلی سپلائی اور دیگر متعلقہ مسائل حل کر سکیں۔ دیہی صارفین اب 5616195 پر ایس ایم ایس بھیج کر اپنے مسائل کا تصفیہ کرا سکتے ہیں۔
- دیہی علاقوں میں ایک کروڑ صارفین کو بھی آن لائن بلنگ سسٹم سے وابستہ کیا گیا ہے۔ پہلے سے سہولت ۱۶۸؍شہروں کے صرف ۶۰؍لاکھ صارفین کو www.uppcl.org پر ڈیجیٹل ای پیمنٹ کی سہولت بھی فراہم کرائی گئی ہے۔
- طلبہ و طالبات کی امتحان کی مدت میں شام ۷؍بجے سے صبح ۶؍بجے تک بجلی سپلائی میں رخنہ اندازی نہ کرنے کی ہدایت۔
- ہائی ٹنشن بجلی کے تاروں سے فصلوں میں لگنے والی آگ سے ہونے والے نقصان کا معاوضہ متعلقہ کسان کو ایک ہفتہ کے اندر فراہم کرایا جائے گا۔
- ضلع ہیڈکوارٹرس کو ۲۴؍گھنٹے، تحصیل اور بندیل کھنڈ کو ۲۰؍گھنٹے اور مواضعات کو ۱۸؍گھنٹے بجلی سپلائی کی جائے گی۔
- خراب ہونے والے ٹرانسفارمرس کو شہری علاقوں میں ۲۴؍گھنٹے میں اور دیہی علاقوں میں ۴۸؍گھنٹے میں تبدیل کیا جائے گا۔
- آئندہ ۱۰۰؍دنوں میں ۵؍لاکھ نئے کنیکشن دئے جائیں گے۔
- ریاستی حکومت اکتوبر ۲۰۱۸ء تک ریاست کے دیہی اور شہری علاقوں میں سبھی صارفین کو 24X7 بجلی سپلائی مہیا کرائے گی۔ زرعی علاقوں کے لئے بجلی سپلائی کے گھنٹوں کو ضرورت کے مطابق ریاستی حکومت طے کرے گی۔
- ریاست کے ہر گھر کو میعاد بند مدت کے تحت سال ۲۰۱۹ء تک بجلی کنیکشن مہیا کرایا جائے گا۔
- ۱۰؍ہزار سولر پمپ لگائے جائیں گے۔

❑❑❑

وزیر اعلیٰ جناب یوگی آدتیہ ناتھ اپنی رہائش گاہ پر ایک جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے (۱۳؍اپریل ۲۰۱۷ء)

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ جناب یوگی آدتیہ ناتھ یکیٰ گنج، لکھنؤ میں گرودوارا گرو تیگ بہادر صاحب میں بیساکھی کے موقع پر

وزیر ریاست برائے اوقاف وحج جناب محسن رضا مولانا علی میاں حج ہاؤس، لکھنؤ کا معائنہ کرتے ہوئے

उर्दू मासिक
नया दौर
पोस्ट बॉक्स सं0 146,
लखनऊ – 226 001

वर्ष : 72 अंक 2
मई 2017
मूल्य : 10 रु./–
वार्षिक मूल्य : 110 रु./–

रजिस्ट्री संख्या : 4552/51
एल0 डब्लू/एन0 पी0/101/2006–08
ISSN 0548-0663

प्रकाशक व मुद्रक, सुधेश कुमार ओझा, निदेशक द्वारा सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. के लिए प्रकाश पैकेजर्स, 257 गोलागंज, लखनऊ से मुद्रित एवं प्रकाशन प्रभाग, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र., सूचना भवन, पार्क रोड, लखनऊ–226001 से प्रकाशित–सम्पादक, सुहेल वहीद